رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۸
پیام ادب
ماہنا مصور
جلد (۱)
نمبر (۵)
ماہ جنوری ۱۹۴۴ء
مسئول مدیر
ڈائرکٹر مینجنگ
سید عبدالوہاب
چودھری اقبال سلیم گاہندری
ناشر
ادارۂ اشاعت اردو
عابد روڈ حیدرآباد دکن
چندہ سالانہ چھ روپئے
فی پرچہ آٹھ آنے
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مندرجات

نظرات

سنہ ۱۹۴۳ء رخصت ہوا، اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا اب کوئی ہاتھ اُسے واپس نہیں لاسکتا، وقت وہ رہوار بادپیما ہے جو نہ کسی کے روکے رکتا ہے اور نہ کسی کے لائے واپس آسکتا ہے۔

دُنیا کے لئے یہ سال اپنے تین پیش رؤوں کی طرح بلکہ کسی قدر زیادہ ہولناکیوں اور مصیبتوں کا سال تھا، جنگ بدستور ہو رہی ہے پوری شدت اور پوری تباہیوں کے ساتھ ہو رہی ہے، دنیا کی ہر چیز کمیاب اور اکثر چیزیں نایاب ہیں، زندگی مشکل اور موت آسان ہو رہی ہے۔ سامانِ غذا کا کال پڑا۔ ہزاروں مرگئے، بیاری پھیلی ہزاروں ختم ہوئے۔ گویا دنیا ہم سے اپنا پیچھا چھڑا رہی ہے۔

اُردو زبان اور اُردو ادب کے لئے بھی یہ سال بڑی بڑی مصیبتوں کا سال تھا، کاغذ اور دوسرے سامانِ طباعت پہلے گراں، پھر گراں تر، پھر کمیاب اور آخر میں بڑی حد تک نایاب ہوگئے۔ مصنفین، ناشرین اور مالکان مطابع جانتے ہیں کہ وہ اپنے کام کو کس قدر مختصر کرنے پر مجبور ہوگئے، کتنی اچھی کتابیں بروقت نہ چھپ سکیں، کتنے بہترین مصنفین کے گوہر بار قلموں کو رک جانا پڑا۔

بہر حال جیسا بھی گزرا کلیسائی سنہ ۱۹۴۳ء ختم ہوا، نیا سال شروع ہوا، ہماری دعا ہے کہ یہ سال اچھا رہے۔

نواب مہدی یار جنگ بہادر

اِسال سالِ نو کے موقع پر مشرقی علوم اور مشرقی ادب کے دلدادہ اور سرپرست نواب مہدی یار جنگ بہادر مولوی سید مہدی حسن صاحب بلگرامی کو "سر" کا خطاب ملا ہے۔ خطاب بہتوں کو ملتا ہے مگر ہر خطاب صحیح نہیں ہوتا۔ البتہ نواب مہدی یار جنگ بہادر اپنی ذاتی قابلیت علم پروری اور علم دوستی کی وجہ سے اس خطاب کے نہ صرف مستحق تھے بلکہ خود خطاب کی عزت کا باعث ہیں، اُنھیں خطاب دے کر سرکاری طور پر گویا اس کا اعتراف کیا گیا ہے، یہ گھرانا ہمیشہ سے علم پرور و ادب نواز رہا ہے نواب صاحب کے والد نواب عماد الملک مرحوم کی علم پروری و ادب نوازی کے قصے مشہور ہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ سنہ ۱۹۲۳ء تک نواب عماد الملک مرحوم نے ادب اُردو کی قلم سے، زبان سے، اثر و رسوخ سے، اور مال و دولت سے ایسی خدمت کی ہے جو کبھی نہیں بھولی جاسکتی۔

خود نواب سر مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات سرکار عالی نے جو کتب خانہ آصفیہ کے صدر، دائرۃ المعارف کے معتمد، اور ملک کے تقریباً علمی و ادبی اِداروں کے معین و سرپرست ہیں، ملک میں مشرقی علوم کی جس طرح آبیاری کی ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم خطاب دینے والوں کو صحیح اِنتخاب اور خطاب پانے والے کو اس اعزاز پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

خاں بہادر مولوی احمد محی الدین

دُوسرے خطاب پانیوالوں میں ایک ہستی مولوی احمد محی الدین صاحب کی ہے جو ایک محنتی، فرض شناس، خوش اخلاق، اور غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والے عہدہ دار ہیں، اُن کا اعزاز ہماری مسرت کا باعث ہے اور ہم اُنھیں دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

مشاعرہ

دسمبر کی آخر تاریخوں میں اِدارۂ شرقیہ میں طلبہ نے ایک مشاعرہ کیا۔ حسنِ اتفاق سے

مولانا حسرت موہانی بھی شریک تھے، اچھی اچھی غزلیں اور نظمیں پڑھی گئیں، مشاعرہ میں حضرت ا ہراحسان دریابادی نے ترقی پسند ادب پر ایک نظری تبصرہ بھی کیا۔ اور مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے نے بھی نظم کے علاوہ ایک چھوٹی سی تقریر کی اس میں اُنھوں نے " ترقی پسند ادب" کی گمراہیوں سے اپنی اور اپنی جماعت کی برات کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ مغوات اور عریانیت جسے آج " ترقی پسند ادب " کا نام دیا جا رہا ہے حقیقۃً ترقی پسند ادب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی " ترقی پسند ادیب " کو خدا اور مذہب کے خلاف نعرے لگانے یا عریاں تحریر لکھنے سے کبھی کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

کثافت اور جہالت

" ترقی پسندوں (بزعم خود) کا سب سے بڑا آرگن " ادب لطیف " (لاہور) دسمبر ۱۹۴۱ء کے شمارے میں " رجعت قہقری " کے عنوان سے طالبان ادب کی راہ میں اس طرح کانٹے بچھاتا ہے :-

(۱) " زمانہ کی کروٹوں کے ساتھ ذہنیتیں بھی بدلتی ہیں، جس قوم نے سیاسی اور معاشرتی انقلاب کو محض ایک کھیل سمجھا، اور برسوں کے فرسودہ ڈھرے کو نہ چھوڑا وہ یا تو تہذیب و تمدن کو متعفن کر بیٹھی یا اگر کچھ جرأت کر کے جدت کی طرف جھکی تو ذہنی تذبذب کی زد میں آکر گھر اور گھاٹ دونوں کی نہ رہی "

لفظ " متعفن " یہاں کتنا برمحل (؟) استعمال ہوا ہے ——— !

ع میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

" فضا " " ہوا " یا " ماحول " کو " متعفن کرنا " یا " معطر بنانا " تو سب بولتے اور لکھتے ہیں مگر " تہذیب و تمدن کو متعفن کر دینا " رسالہ ادب لطیف ہی کا حصہ ہے۔ ہم ارباب نظر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس جملہ کو غور سے پڑھیں اور پھر بتائیں کہ جملہ کی ترکیب، مفہوم کے اظہار اور الفاظ کے تناسب کے لحاظ سے اس مقام پر " متعفن " کسی طرح بھی صحیح اور درست ہو سکتا ہے۔

(۲) " ترقی پسند ادیبوں کو جب ماحول کی سنگینی رواجوں کی خون آشامی اور قانون کی زنجیروں کا احساس ہوا اور انھوں نے اردو ادب کو بسم اللہ کے گنبد سے نکال کر زندگی کی بھیانک حقیقتوں سے دوچار کیا " (ادب لطیف)

" ماحول کی سنگینی " کتنی سلجھی ہوئی ترکیب ہے کہ پڑھیئے اور یا تو اپنے ہی ہاتھوں سے سر دھنیئے یا پھر " فضا کی سنگینی " سے سر ٹکرا دیجئے، خدا کے لئے کوئی ہمیں سمجھاؤ کہ " ماحول کی سنگینی " کیا ہوتی ہے ——— ! اور ہاں " رواجوں کی خون آشامی " تو " سنگینی " سے بھی بڑھ گئی۔ اس پر مستزاد بلکہ قیامت بالائے قیامت " قانون کی زنجیروں کا احساس " ! " ادب لطیف " کے اس " شہ پارے " کو ایک بار پھر پڑھیئے اور سوچیئے کہ لکھنے والے کا آخر مفہوم کیا ہے، کہنا کیا چاہتا ہے اور اظہار مفہوم کے لئے کونسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

کیا " ترقی پسندی " الجھاؤ، ابہام، اہمال اور عدم توازن کو کہتے ہیں، کہ جو دل میں آیا لکھ دیا، نہ مبتدا کو خبر سے ربط، نہ جملوں کی " ہیئت ترکیبی " میں کوئی حسن اور تناسب اور " لفظ " کی تو کوئی قدر و قیمت ہی نہیں جو لفظ جہاں چاہا استعمال کر دیا، کوئی اعتراض کرے اور ٹوکے تو پیشانی پر شکنیں ڈال کر فرمایا جاتا ہے کہ " ہم اردو کو بسم اللہ کے گنبد سے نکال کر زندگی کی بھیانک حقیقتوں سے دوچار کر رہے ہیں " تو جو " ادب " زندگی کی " بھیانک اور ڈراؤنی حقیقتوں " کا ترجمان ہو، اس کے الفاظ بھی کیا " بھیانک اور ڈراونے " ہی ہونے چاہئیں۔ اور " قانون کی زنجیروں کا احساس " کیا " زبان کی نزاکتوں کے احساس " سے وجدان کو غافل بنا دیتا ہے۔ لٹریچر کا دار و مدار تو " زبان " پر ہے اگر زبان تباہ ہو گئی تو

کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور آپ کی "تازہ کلبلاہٹ" کتنے دلوں میں "جھلاہٹ" پیدا کر رہی ہے۔

بہت ہی پامال اور پرانی کہاوت ہے کہ ایک جاٹ اپنے سر پہ کھاٹ لئے جا رہا تھا، ایک تیلی نے دیکھ کر کہا "جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ" اس پر جاٹ نے (جو غالباً ترقی پسندی کی طرف مائل تھا اور زندگی کی بھیانک حقیقتوں سے دوچار ہو چکا تھا) فی البدیہہ یہ ارشاد فرمایا "تیلی رے تیلی تیرے سر پہ کولھو" تیلی نے کہا "قافیہ تو جوڑ نہیں ملا" جاٹ بولا "اس سے کیا ہوتا ہے اَبے تو بوجھ تو مرے گا" ۔۔۔ تو ہمارے ترقی پسندوں کو بھی لفظ کی صحت، زبان کی نزاکت، ترکیب کی بندش محاوروں کے صحیح استعمال سے بحث نہیں اور "ادبِ لطیف" ترقی پسندوں کی اس "بے راہ روی" اور "غلط نگاری" کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ یہ وہی ادبِ لطیف ہے، جو اپنے زعم میں یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان کے تمام رسالے اس کے خیالات اور جدت طرازی کی چوری کر رہے ہیں اور جہاں کہیں بھی "نیا ادب" "نئی زندگی" "نئی شاہراہ" لکھا ہوا ملتا ہے" "یہ ادبِ لطیف" کا اتارا ہوا چربہ ہے۔

ادبِ لطیف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ملک کا سنجیدہ طبقہ زبان و ادب میں اس قسم کے ناروا تصرفات کو اب برداشت نہیں کر سکتا اور زمانہ اس قسم کے "سیاہ اوراق" کو اردو ادب کی بیاض سے نوچ کر پھینک دے گا۔

غزل

نجمہ تصدق

مجھے دیکھو حوادث کے تھپیڑے کھائے جاتی ہوں
مگر ہر حادثے پر جھومتی ہوں، مسکرائے جاتی ہوں

کسی کی یاد ہی اب آسرا ہے زندگانی کا
کسی کی یاد سے قلب و جگر گرمائے جاتی ہوں

یہ احساسِ زیاں کیا اور تمیزِ نیک و بد کیسی؟
خدا کا کردہ مَیں کیا ہوش میں پھر آئے جاتی ہوں؟

میری ہستی معاذ اللہ! مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ اک رُومان بن کر دو جہاں پر چھائے جاتی ہوں

مآلِ کار کیا ہوگا؟ میں کب سوچوں، میں کیا سوچوں،
ابھی تو ہستیِ رنگیں کے دھوکے کھائے جاتی ہوں

مسلسل سرخوشی کا یہ زمانہ، آہ یہ لمحے!
زباں خاموش ہے لیکن نظر سے گائے جاتی ہوں

یہ کس کافر کا کیف آگیں تصور آگیا نجمہ
کہ اپنی زلف کو بیساختہ لہرائے جاتی ہوں

ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ (۵) بالکل غلط ہے۔ انھیں نہیں معلوم کہ فارسی الفاظ کی جمع سالم۔ ا۔ ت۔ کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔

علی اختر

حسنِ سرِ راہ

ہوئی ہے آج یہ کس سے مری نگاہ دوچار — کہ چاک چاک ہوا جا رہا ہے دامنِ ہوش
بساطِ خاک پہ یہ موجِ رنگ ہے کیسی — کیا ہے خاک کے ذروں کو جس نے آئنہ پوش
مچل رہی ہیں رگ و پئے میں کیف کی موجیں — یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا سازِ خموش
ہجومِ رنگ سے ہے نبضِ کاہ میں حرکت — وفورِ حسن سے ہے موجِ خاک لالہ فروش
اُبھار رہا ہے کوئی بزمِ راز کے پردے — سرودِ موجِ صبا ہے کہ ہے نوائے سروش
ندیم کس کو ملی ہے یہ نعمتِ سرمد — نگاہِ جلوہ شناس و نگارِ جلوہ فروش

گئی وہ تیرگیٔ شب وہ رسمِ بےخبری
جبینِ دہر پہ چمکا ستارۂ سحری

نگاہِ محرمِ اسرار ہو تو بزمِ حیات — نہیں کچھ اور بجز اک ادائے جلوۂ ناز
کھلا ہوا ہے ازل سے درِ حریمِ جمال — کوئی حجاب ہے صبر آزما نہ پردۂ راز
جھلک رہا ہے پیالوں میں رنگِ بادۂ ناب — لرز رہی ہے سرِ دوش موجِ زلفِ دراز
جدا ہے عقل کی منزل سے بیخودی کا مقام — نہ پیچ و خم ہیں نہ اس راہ میں نشیب و فراز
درونِ ساغرِ دل چاہیئے رہیں تپش — وہ موجِ بادہ کہ ہو آتشِ پیالہ گداز
یہ مشتِ خاک اور اتنی بصیرت افروزی — مگر عمیق ہے کتنا فریبِ حسنِ مجاز

نہاں ہے بےخبری میں نشاطِ منزل بھی
شکستِ دل میں ہے تعمیرِ ہستیٔ دل بھی

(ڈاکٹر) عاشق حسین بٹالوی

مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی مرحوم و مغفور

ذہنی، سیاسی یا علمی انقلاب عام طور پر دو قسم کی شخصیتوں کا شرمندۂ احسان ہوتا ہے۔ ایک وہ جو رعد کی گرج اور بجلی کی چمک کی طرح نمودار ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی معرکہ آرائیوں سے زندگی کی بساط الٹ ڈالتی ہیں دوسری قسم اُن لوگوں کی ہے جو دنیا کے ہنگاموں سے دور، نمود و نمائش سے الگ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر علم و اَدب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے اس طرح کام لیتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ایک زمانہ اُن کے ہاتھوں مسخر ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ شہرت سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ناموری کی تکالیف میں نہیں پڑتے۔ اس لئے اپنی زندگی میں بالعموم زیادہ مشہور نہیں ہونے پاتے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے اُن کے علمی و ادبی کارنامے اُجاگر ہوتے جاتے اور آئیوالی نسلیں اُن کارناموں کو ایک قومی متاع سمجھکر نہ صرف اُن پر فخر کرتی ہیں بلکہ اُن کی روشنی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں مؤرخ اسلام حضرت مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم ہندوستان کی ایسی ہی قابل قدر ہستیوں میں سے تھے۔

آج سے بیس پچیس برس پہلے میں نے مولانائے مرحوم کو پہلی مرتبہ لاہور میں دیکھا تھا۔ میں مسلم ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور وہ وہاں مدرس تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ کی نگہداشت کا فرض بھی اُنہی کے ذمے تھا۔ میں بھی چونکہ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اس لئے صبح سے شام تک تقریباً سارا دن اُن کے ساتھ گزرتا تھا۔ یہ صحبت کم و بیش دو سال قائم رہی۔ اس کے بعد مولانا واپس نجیب آباد تشریف لے گئے۔ اور پھر آخر دم تک اُنھوں نے نجیب آباد چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اسکول کی زندگی میں میں مولانا کے علمی پائے سے تو خیر کیا واقف ہو سکتا تھا لیکن قرب و یکجائی کی وجہ سے میں آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے خیالات و جذبات کو مولانا کے مزاج کے ساتھ کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور ہے۔ اُردو زبان اور اَدب کے ساتھ جو لگاؤ مجھے بچپن سے ہے اُس نے مجھے مولانا کے اور زیادہ قریب کر دیا تھا۔ اور وہ میری اس دلچسپی کو دیکھکر ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ بہت حد تک یہ اُنہی کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے کہ اَدب اُردو سے میری دلچسپی ایسی پختہ ہوئی کہ یہ ذوق اَب تک برقرار ہے۔

اِسکول میں مولانا کی سخت تاکید تھی کہ تمام طلبہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کریں۔ ہوسٹل میں وہ پانچوں وقت نہایت باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھتے تھے اور امامت خود کرتے تھے۔ نمازِ فجر کے بعد نصف گھنٹہ قرآن مجید کا اور نمازِ عشا کے بعد امام غزالی کی احیاء العلوم کا درس دیا کرتے تھے۔ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب کو اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی ہو جاتی تھی احیاء العلوم کا درس دینے کی بجائے وہ گھنٹہ بھر صرف گفتگو کرتے تھے اور اس گفتگو کے لئے وہ طلبہ کی قابلیت اور استعداد کے پیش نظر کوئی ایسا موضوع تلاش کر لیتے تھے جو دلچسپ اور مفید ہو۔ اس قسم کی گفتگو میں اکثر تاریخی، اَدبی اور مذہبی

مسائل پر ہوا کرتی تھیں۔ اور لڑکوں کو اجازت تھی کہ پوری آزادی اور بے تکلفی سے بحث میں حصہ لیں۔ چنانچہ اُن محفلوں کا نقشہ اب تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ قہقہے بھی لگتے تھے۔ مذاق بھی ہوتا تھا۔ فقرے بھی چست کئے جاتے تھے۔ اور مولانا بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ اُن کے گرد و پیش بیٹھنے والے طلبہ آدابِ محفل سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ وہ اکثر لکھنؤ اور دہلی کی قدیم محفلوں کا تذکرہ کرتے اور وہاں کی نشست و برخاست کے طریقے اور بات چیت کے انداز بتاتے رہتے تھے۔ مولانا کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ اِس کے علاوہ ورزش کا بھی شوق تھا طلبہ کو ہمیشہ ورزش کی تلقین کرتے تھے۔ لاہور سے جہانگیر کے مقبرے تک پیادہ پا جانا اور واپس آنا اُن کا معمول تھا تیراک بھی بہت اچھے تھے۔ ایک مرتبہ برسات کا موسم تھا۔ چھٹی کے روز مولانا ہوسٹل کے تمام طلبہ کو ہمراہ لے کر تفریح کے لئے شاہدرہ گئے۔ چونکہ نوعمر طلبہ کے لئے اِتنی دُور پیدل جانا ممکن نہ تھا اس لئے کرائے کے تانگے لے لئے تھے۔ راستے میں دریائے راوی چڑھا ہوا تھا اور پانی کناروں سے اُچھل رہا تھا۔ مولانا اِس منظر کو دیکھ کر للچا گئے اور دریا میں تھوڑی دیر نہانے کے لئے تانگے رکوا لئے گئے بعض دوستوں نے منع کیا کہ دریا میں طغیانی ہے۔ ایسی حالت میں نہانا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن مولانا نے پروا نہ کی اور پانی میں کود پڑے۔ وہ تیرتے ہوئے بہت دُور نکل گئے دریا کی تیز و تند موجوں میں وہ بہت بے باکی سے تیر رہے تھے۔ جب واپس کنارے پر آئے تو تکان سے نڈھال ہو چکے تھے۔ بنوٹ اور گتکے میں بھی انہیں اچھی خاصی مہارت تھی۔ کبھی کبھی شوق آتا تو اسکول کے میدان میں خود اپنے ہاتھ سے اِس فن کے کرتب دکھاتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے زوال کے اسباب میں سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے سپاہیانہ

زندگی ترک کر کے عیش و آرام کی عادتیں اختیار کر لی ہیں۔ اِنہی دنوں میں اُنھوں نے ایک اَسی صفحے کا رسالہ "سپاہیانہ زندگی" کے عنوان سے لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا تھا۔ اسکول میں اُن کا قیام مولانا محمد علی ایم۔ اے مترجم ترجمۃ القرآن انگریزی اور خواجہ کمال الدین مرحوم کی وجہ سے تھا۔ اِن دونوں بزرگوں سے مولانا کے قدیمی تعلقات تھے اور اُنہی کے اصرار پر وہ لاہور میں مقیم تھے۔

مولانا کی وجہ سے اکثر مشہور و معروف اور ذی علم حضرات اِسکول میں آتے رہتے۔ اور اِس طریقے سے ہمیں بھی اُن کی زیارت کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔ میں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کو جو وزیرِ ہند کی کونسل کے رُکن تھے اور غالباً رخصت لے کر ہندوستان تشریف لائے تھے سب سے پہلے اُس زمانہ میں دیکھا تھا۔ وہ مولانا سے ملنے کے لئے لاہور تشریف لائے تھے۔ علامۂ اقبال کے ہاں مولانا ہفتے میں دو، ایک بار ضرور جایا کرتے تھے علامۂ مغفور اُس وقت انارکلی میں رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت علامہ کے دولت کدہ پر حاضر ہونے اور اُن کی باتیں سُننے کا فخر پہلے پہل مجھے مولانا ہی کی وجہ سے حاصل ہوا تھا میں نے اُس ملاقات میں دیکھا کہ علامۂ اقبال کے سامنے مولانا نہایت ادب سے بیٹھے ہیں اور اُن کی ہر بات پر جی کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر خود کوئی ایک آدھ بات کرتے بھی ہیں تو بہت مختصر۔ جب رخصت ہو کر باہر نکلے تو میں نے مولانا سے اُن کے اِس طرزِ عمل کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے "بھئی تم نہیں جانتے، اقبال ہندوستان کا سب سے روشن دماغ انسان ہے۔ ہم لوگ اُس کے پاس بعض علمی مسائل سمجھنے کے لئے آتے ہیں۔ اِس لئے ہمارا یہاں چپ رہنا ہی بہتر ہے۔" اس کے باوجود حضرت علامہ مولانا کے بہت بڑے قدردان اور اُن کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔

ان دنوں مولانا کے ملاقاتیوں میں گورنمنٹ کالج

کے پروفیسر مرحوم دہری عبدالمجید خاں، اسلامیہ کالج کے پروفیسر سید عبدالقادر، مولانا انشاء اللہ خاں مرحوم اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ مرحوم زیادہ نمایاں تھے۔ یہ حضرات اکثر ملاقات کو آتے رہتے تھے۔ دو، ایک مرتبہ سر فضلِ حسین بھی جو اس زمانے میں پریکٹس کرتے تھے اور ابھی پنجاب کے وزیرِ تعلیم نہیں بنے تھے تشریف لائے تھے۔ مولانا کو اپنی اس وقت تک کی زندگی میں جن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا ان میں سے دو شخصیتوں نے اُن کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ ایک حکیم نورالدین صاحب قادیانی اور دوسرے علامہ اقبال۔ چنانچہ حکیم صاحب مرحوم کے زمانۂ حیات میں وہ دو، ایک برس کے قریب اُن کے پاس ٹھہرے رہے۔ اور اپنے تاثرات کو اُنھوں نے ایک کتاب کی صورت میں قلم بند بھی کیا تھا۔ وہ کتاب "مرقاۃ الیقین فی حیاتِ نورالدین" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں دیگر مصروفیتوں کے باعث مولانا کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف کم رہتی تھی؛ اس زمانہ کی یادگار صرف تین مختصر سے رسالے ہیں۔ پہا ہیانہ زندگی کا میں اُوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے مولانا محمد علی کے ایما پر ایک ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب مذہب اور تلوار کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا گیا تھا کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے نہیں ہوئی۔ اُنہی ایام میں اُنھوں نے ایک رسالہ اکابرِ قوم لکھا تھا جس میں ہندوستانی مسلمانوں کی اس زمانہ کی قومی تحریکات پر اتنی پُرلطف اور زبردست تنقید تھی کہ ملک بھر میں دُھوم مچ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اکابرِ قوم کی اشاعت کے بعد مولانا کو موافقت اور مخالفت کے بے شمار خطوط آیا کرتے تھے۔ مخالف اُن کو گالیاں لکھ لکھ کر بھیجتے تھے اور مولانا پڑھ کر بے اختیار ہنس دیتے تھے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ حلقے میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا وجاہت حسین مرحوم، مولانا محمد دین فوق اور راجہ نریندر ناتھ سے اُن کے اچھے مراسم تھے۔

مولانا کا قد لمبا تھا۔ اِتنا لمبا کہ سو پچاس کے مجمع میں وہ صاف نظر آ جاتے تھے۔ رنگت سانولی تھی۔ لیکن چہرے پر گھنی ڈاڑھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن تھیں۔ مخاطب کی طرف جب گھور کر دیکھتے تھے تو مجرم کا ضمیر بھی اُن آنکھوں کے سحر سے کانپ اُٹھتا تھا۔ آواز نہایت بلند اور خوش آہنگ تھی۔ ہمیشہ سیدھے کھڑے ہوتے تھے۔ تیز رفتار تھے۔ اور چلتے وقت ہمیشہ تن کر چلتے تھے۔ شائستگی، حیاداری، حفظِ مراتب اور پاکیزگی کا تو وہ نمونہ تھے۔ مخالف کی رائے کو نہایت تحمل سے سُنتے تھے۔ طویل سے طویل بحث میں بھی جب فریقِ مخالف بد زبانی پر اُتر آتا تھا وہ نہایت صبر و سکون سے بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب نہ ہوتی تھی۔ اور اُن کی پیشانی پر شکن تک نہ آتی تھی۔ اُن کی صحت بالعموم بہت اچھی رہتی تھی۔ کھانے پینے کے وہ قطعاً شوقین نہ تھے۔ سوکھی روٹی پانی کے ساتھ کھا لینے یا چنے چبا کر گزارہ کر لینے سے اُنہیں عار نہ تھی۔ اکثر روٹی بغیر سالن کے کھاتے تھے۔ مقرر وہ بہت اچھے نہیں تھے۔ لیکن گفتگو میں تو اُنہیں ایسا ملکہ تھا کہ گھنٹوں اُن کی باتیں سُنتے رہیئے۔ کیا مجال کہ طبیعت اُکتا جائے اُن کی گفتگو میں وہی دلآویزی وہی روانی اور وہی شگفتگی تھی جو اچھی سے اچھی ادبی تحریر میں ہوتی ہے اُن کی بے تکلف گفتگو اگر ضبطِ تحریر میں لائی جاتی تو شاید زبان محاورہ کی ایک غلطی بھی اس میں نظر نہ آتی پنجاب جس ذوق و شوق سے اُردو کی خدمت کر رہا ہے آپ اس کے وہ بہت بڑے مداح تھے۔ اور یو پی اور پنجاب کی روائتی کشمکش سے اُنہیں سخت نفرت تھی۔ لیکن اُس کے باوجود وہ اُردو میں ہندی الفاظ یا پنجابی محاورے رائج کرنے کے مخالف تھے۔ جوانی میں شاعری کا شوق بھی رہا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ ٹھوس علمی مشاغل نے

اس کو دبا دیا تھا۔ مولانا کا لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ گاڑھے کا کرتہ، موٹے سے کپڑے کی شیروانی اور ڈھیلا شرعی پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے۔ جاڑوں میں کبھی کبھی چھینٹ کی روئی دار شیروانی بھی استعمال کرلیتے تھے۔ سر پر بالعموم عمامہ باندھتے تھے۔ گرمیوں میں گاہے گاہے چکن یا ململ کی چار کونوں والی اونچی دیوار کی ٹوپی زیبِ سر فرماتے تھے جوتا ہمیشہ نجیب آباد کا بنا ہوا دیسی ساخت کا استعمال کرتے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے سردی یا گرمی میں انہیں کبھی موزے پہنے دیکھا ہو۔

مولانا ہرچند کہ بہت پکے، راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُن میں قومی عصبیت بھی کچھ کم نہ تھی۔ انھیں اپنے نسب پر فخر تھا۔ اور اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے وقت وہ ہمیشہ سربلندی و افتخار کے جذبات سے لبریز ہو جاتے تھے۔ نواب نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں، نواب دوندے خاں اور روہیلکھنڈ کے دوسرے قومی اکابر کو وہ اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا محسن کہتے تھے۔ پانی پت کی تیسری لڑائی تو اُن کے نزدیک درحقیقت روہیلوں اور مرہٹوں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس جنگ کا نقشہ اور میدانِ کارزار کی جزئیات اُنہیں اس تفصیل کے ساتھ یاد تھیں کہ سننے والے کو محسوس ہوتا تھا کہ شاید وہ خود جنگ میں شامل رہ چکے ہیں اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں۔ قومی عصبیت کے جوش میں وہ بعض اوقات اس حد تک غلو کرتے تھے کہ اُنہیں غلام قادر روہیلہ کے اس فعل پر کہ اس نے مغل بادشاہ شاہ عالم کی آنکھیں نکال لی تھیں اظہارِ ملامت کرنے سے بھی انکار ہوتا تھا۔ وہ غلام قادر کو حق بجانب قرار دینے کے لئے تاریخی اسباب بیان کرتے تھے۔ علامۂ اقبال نے جب غلام قادر روہیلہ پر اپنی مشہور نظم لکھی تو مولانا نے اعتراض کیا کہ یہ واقعہ جو نظم میں بیان کیا گیا ہے تاریخی حیثیت سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا۔

آخر لاہور میں دو، ڈھائی سال کے قیام کے بعد وہ واپس نجیب آباد تشریف لے گئے۔ اُن کے پیشِ نظر تصنیف و تالیف کا ایک وسیع پروگرام تھا۔ اور اس پروگرام کی تکمیل کے لئے یکسوئی اور گوشۂ تنہائی کی ضرورت تھی۔ لاہور میں فراغت کا میسر آنا قریب قریب ناممکن تھا۔ اس لئے اس متاع کی تلاش میں اُنہیں مجبوراً وطن مالوف کا رُخ کرنا پڑا۔ لاہور چھوڑنے سے پہلے اُنھوں نے اپنے احباب کے سامنے اپنا مجوزہ تصنیفی پروگرام پیش کیا تو سب نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ مولانا کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ اور روپے کے بغیر اس پروگرام کی تکمیل محال نظر آتی تھی۔ مولانا تو ابتدا سے ایک توکل پیشہ درویش تھے۔ اُنھوں نے تمام مشکلات کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور نجیب آباد چلے گئے وہاں جاکر اُنھوں نے اپنا مشہور تاریخی رسالہ عبرت جاری کیا۔ جو افسوس ہے کہ دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا لیکن اس دو سال کے عرصہ میں عبرت نے تاریخِ اسلام و تاریخِ ہند کے متعدد پہلوؤں پر جو مضامین شائع کئے اُنھوں نے ہندوستان میں دھاک بٹھا دی۔ عبرت کا کاغذ بہت معمولی اور لکھائی چھپائی بھی کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ لیکن ان ظاہری نقائص کے باوجود حالت یہ تھی کہ علامۂ اقبال ایسے بزرگ بھی ہر مہینے عبرت کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔ اور ہر نمبر کو اول سے آخر تک مطالعہ فرماتے تھے۔ عبرت کے تمام مضامین خود مولانا کے لکھے ہوتے تھے۔ علامۂ اقبال کی خدمت میں چونکہ میں بھی گاہے گاہے حاضر ہوتا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ وہ مولانا کے ہر مضمون کی داد اُن کو خط لکھکر دیا کرتے تھے۔ ایک اسی قسم کا مختصر سا خط حضرت علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس ابھی محفوظ ہے جس پر ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء کی تاریخ درج ہے۔ اس خط کی عبارت یہاں درج کردینا شاید بے محل نہ ہوگا۔

مخدومی۔ السلام علیکم۔

اِمسال عارضۂ نقرس کی وجہ سے بہت تکلیف رہی اب خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ امیر خاں[1] پر آپ نے خوب لکھا۔ خدائے تعالیٰ اس کے جانشینوں کو بھی ہدایت دے کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے دستکش ہو جائیں۔ صدیق رضی اللہ عنہ پر بھی خوب مضمون لکھا گیا ہے۔ میں نے ان کی زندگی کے تمام واقعات ایک شعر میں جمع کر دیئے ہیں ؎

ہمتِ اُو کشتِ ملت را چو ابر
ثانیِ اِسلام و غار و بدر و قبر

اُمید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسّلام

محمد اقبال لاہور
۲۲/ستمبر ۱۹۲۲ء

عبرت جاری کرنے کے ساتھ ہی مولانا نے اپنی مشہور تصنیف آئینہ حقیقت نما کی بنیاد بھی رکھدی تھی۔ آئینہ حقیقت نما جو تین جلدوں پر مشتمل ہے تاریخ ہند کا ایک شاہکار ہے یہ کتاب، جو افسوس ہے کہ بعض مجبوریوں کے باعث مکمل نہ ہو سکی، اِس خیال کو سامنے رکھکر لکھی گئی تھی کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا۔ آئینہ حقیقت نما ملک میں بے حد مقبول ہوئی۔ اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر تعلیم صوبۂ بہار نے (جو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے رُکن ہیں) جیل میں اس کتاب کے کچھ حصے کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ بعد میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سبب سے وہ اس ترجمے کو مکمل نہ کر سکے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے یہ کتاب ہدیۃً مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کی تھی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے آئینہ حقیقت نما پڑھنے کے بعد فرمایا تھا کہ:-

"اگر میں امیر آدمی ہوتا تو مولانا اکبر شاہ خاں کو موتیوں میں تول دیتا"

آئینہ حقیقت نما کے بعد مولانا نے تین جلدوں میں تاریخ اِسلام لکھی جسے صوفی پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاؤالدین نے حقِ تصنیف لے کر شائع کیا۔ پھر حجۃ الاسلام لکھی گئی۔ حجۃ الاسلام پڑھکر علامہ اقبال نے سو روپے اپنی جیب سے روانہ فرمائے تاکہ اس کتاب کی کاپیاں مستحق لوگوں میں مفت تقسیم کی جائیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے رسائل کے علاوہ یکے بعد دیگرے قولِ حق۔ معیار العلماء، نظام سلطنت اور مقدمہ تاریخ ہند قدیم کی دو جلدیں معرضِ وجود میں آئیں۔ افسوس ہے کہ مولانا اپنے عزم و ارادہ اور اپنے دوستوں کے پیہم اصرار کے باوجود بعض تلخ اسباب کی بنا پر ہندوستان کی تاریخ مکمل نہ کر سکے۔ اگر مولانا کے قلم حقیقت رقم سے تاریخ ہند مرتب ہو جاتی تو آج ہندوستان کے ماضی پر سے جہل و نادانی کے بہت سے پردے چاک ہو گئے ہوتے۔

مولانا کی تمام تصانیف شبانہ روز محنت اور انتہائی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ وہ ایک کتاب پر برسوں محنت کرتے تھے۔ تیاری کے لئے ہر قسم کا مواد جمع کرتے تھے اور پھر کہیں جاکر قلم اٹھاتے تھے۔ اُن کے کتب خانے میں تاریخ کی بعض نایاب کتابیں تھیں جن کی تلاش و جستجو میں انھوں نے بہت سی مالی اور جسمانی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے اُنہیں اطلاع دی کہ منشی سبحان رائے بھنڈاری بٹالوی کی کتاب خلاصۃ التواریخ کا ایک قدیم نسخہ جو عہد اورنگ زیب میں لکھا گیا تھا۔ منشی صاحب آنجہانی کے خاندان کے

[1] نواب امیر خاں بانیٔ ریاست ٹونک ——— "م"

لوگوں کے پاس بٹالہ میں موجود ہے۔ وہ میرا خط پڑھتے ہی
نجیب آباد سے چلے اور سیدھے بٹالہ تشریف لے آئے۔
خلاصۃ التواریخ کا جو نسخہ اُن کے پاس موجود تھا وہ بھی ہمراہ
لیتے آئے تاکہ اس کا مقابلہ بٹالہ والے نسخے سے کر سکیں۔

دولت علم اور دولت دنیا کی آپس میں پرانی دشمنی
ہے۔ یہ دونوں دولتیں ایک ہی وقت میں ایک جگہ جمع
نہیں ہو سکتیں یہی حالت مولانا کی تھی وہ تمام عمر علم و
ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ لیکن
ان کی ساری زندگی تنگدستی اور مفلسی میں گزر گئی
اُن کے بعض احباب نے جن میں سر راس مسعود، علامہ
اقبال اور نواب سر محمد اکبر خاں آف ہوتی شامل تھے کئی مرتبہ
کوشش کی کہ وہ نجیب آباد سے نکل کر لاہور، بھوپال، حیدرآباد
یا علیگڑھ تشریف لے جائیں۔ لیکن وہ جواب میں ہمیشہ
یہ کہہ کر۔ ع

تاب زنجیر ندارد دل دیوانۂ ما

خود بھی چپ ہو جاتے اور دوسروں کو بھی چپ کرا دیتے
ایک مرتبہ ہندوستان کی ایک بہت بڑی ریاست نے ازراہ
علم پروری انہیں اپنے یہاں بلایا تھا لیکن انہوں نے
جانے سے انکار کر دیا۔

مولانا ملک کے سچے خادم اور قوم کے نڈر سپاہی
تھے ان کی قوم پرستی اور وطن پروری ہندوستان کے
بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے لئے نمونہ عمل تھی۔ انکی
مہمان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ مہمان کی خاطر مدارات میں
وہ گھر بار لٹا دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ مجھے دو مرتبہ
نجیب آباد جانے اور اُن کے پاس چند روز ٹھہرنے کا
اتفاق ہوا ہے۔ ہر چند کہ خدمت کے لئے ملازم موجود تھے
لیکن وہ اپنے ہاتھ سے مہمان کا بستر بچھاتے، اُس کے
لئے کھانا لاتے، غسل کا پانی رکھتے غرض کہ چھوٹے سے
چھوٹا کام خود کرتے تھے اور مہمان کی آسائش میں اس
قدر کوشاں رہتے کہ اپنا آرام ضائع کر بیٹھتے تھے۔ وہ
دوستوں کے دکھ درد میں ہمیشہ شریک ہوتے تھے اور
مصیبت میں مبتلا انسان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے
آخری عمر میں مالی دقتوں نے انہیں زیادہ پریشان
کر دیا تھا۔ لیکن ضبط اور وضعداری کا یہ عالم تھا کہ
انھوں نے کسی سے اس کا ذکر بھی مناسب نہ سمجھا۔
چہ جائیکہ وہ مدد کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا
کرتے۔ ۱۹۳۲ء میں جب وہ مقدمہ تاریخ ہند قدیم کی
پہلی جلد شائع کرنا چاہتے تھے تو اُن کے پاس روپیہ
بالکل نہیں تھا۔ اس حالت میں جو خط انہوں نے مجھکو
لکھا اس کی چند سطریں یہاں نقل کرتا ہوں۔ اس سے
اُن مصیبتوں کا کچھ علم ہو سکے گا جن میں ہمارے ملک
کے اہل علم مبتلا ہیں۔ مولانا اپنے گرامی نامے میں لکھتے
ہیں:-

"اس مقدمہ کے چھپوانے کے لئے
آٹھ سو روپے کا اندازہ ہے۔ اور وہ
میرے پاس موجود نہیں۔ تمام ذرائع
آمدنی ختم اور مسدود نظر آتے ہیں
ہاں خدائے تعالیٰ کی ذات سے توقع
ہے کہ وہ اس محنت کو ضائع نہیں ہونے
دے گا۔ میرے پاس کتبۂ عبرت میں
اس وقت تین ہزار روپے سے زیادہ
کی فروختنی کتابیں ہیں۔ جن کی فہرست
آپ کو معلوم ہے۔ میں چاہتا ہوں
کہ یہ پورا اسٹاک کوئی شخص آٹھ سو
روپے میں خرید لے۔ مگر تین ہزار کی
کتابیں آٹھ سو روپے میں خریدنے والا
کوئی نہیں ملتا۔ حالانکہ چوتھائی قیمت
میں کتابوں کے خریدنے سے نقصان
کسی تاجر کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کتابیں
نکل جانے والی ہیں۔ آپ اگر لاہور میں

کسی امیر اور مالدار کتب فروش کو آمادہ کر سکیں (مگر اپنے طور پر جس میں میری کوئی چوا خیزی نہ ہو) تو دریغ نہ فرمائیں اور کسی کو آمادہ کریں۔ یہ بات انتہائی خلوص و بے تکلفی کی راہ سے لکھی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سال بھر کے بعد اگر کتابیں فروخت سے بچ جائیں تو بچی ہوئی کتابوں کو میں چوتھائی قیمت میں نہیں بلکہ تہائی قیمت دے کر واپس لے لونگا کیونکہ مقدمہ کی اشاعت کے بعد یقیناً میرا کام چل نکلے گا؟

جولائی ۱۹۳۶ء سے مولانا کی صحت خراب ہونا شروع ہوئی۔ انہیں ضعف معدہ کی شکایت تھی اور دن میں کئی دست آجاتے تھے۔ علاج نجیب آباد ہی میں ہوتا رہا۔ اس دوران میں کبھی افاقہ ہو جاتا اور کبھی پھر مرض لوٹ آتا تھا۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں ان کی حالت قدرے تشویش ناک ہو گئی تھی۔ اپریل کے آخری دنوں میں وہ تبدیل آب و ہوا اور علاج کے لئے ایک دوست کے پاس جوالا پور تشریف لے گئے۔ وہیں پر دیس میں ۱۰ مئی کو انھوں نے انتقال فرمایا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

گھر

مخدوم محی الدین

گھر کے ہر ذرے سے ناسور کی بو آتی ہے
قبر کی عود کی کافور کی بو آتی ہے

ہم اسیروں کی بھی ایک عمر بسر ہوتی ہے
نہ تو موت آتی ہے ہمدم نہ سحر ہوتی ہے

قطعہ

تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

قطعہ

محمد عبدالرحمن بجاں

یک مصیبت پیش دانا مطلع صد راحت است
گر یقینت نابد سوئے آسماں گرداں نگاہ
جلوۂ خورشید اگر در تیرہ شب ناید نظر
چوں کواکب می درخشد صد ہزاراں مہر و ماہ

رباعی

نسیم حسینی

دنیا کی ہر اک چیز کو جاودانی کر دے
خنکیٔ مرگ کو سوز زندگانی کر دے
تجھ کو تیرے ہلکے سے تبسم کی قسم
آتش طور کو پانی پانی کر دے

فصاحت جنگ جلیل

غزل

چال سے فتنۂ خوابیدہ جگاتے آئے
آپ جب آئے قیامت ہی اٹھاتے آئے

چال متوالی، نظر مست، ادا میں مستی
ذرے ذرے کو وہ میخانہ بناتے آئے

نالۂ گرم نے اتنا نہ کیا تھا رسوا
اشک کمبخت تو اور آگ لگاتے آئے

طے ہوئی آہ کی تائید سے منزل اپنی
جا بجا راہ میں ہم شمع جلاتے آئے

آئے ہم سوئے قفس چھوڑ کے جب گلشن کو
آہ سے آگ نشیمن میں لگاتے آئے

انکی کیا بات جو ہنس ہنس کے لب رنگیں سے
پھول برساتے گئے باغ لگاتے آئے

آئے بھی وہ جو مرے پاس تو یوں آئے جلیل
شعلۂ آہ سے دامن کو بچاتے آئے

قدوس صہبائی

مول چند آب کی بار چوری اور نقب زنی کے الزام میں تین سال کی سزا کاٹ کر جب اپنے گاؤں واپس پہونچا تو برادری نے ذات میں شامل کرنے کے لئے اس پر دو سو روپیہ کا تاوان لگایا۔ اسے ساری برادری کو کھلانا اب ضروری ہو گیا تھا ورنہ وہ اچھوت سے بھی بدتر سمجھا جاتا۔ کیونکہ جب آدمی ذات باہر ہو جاتا ہے تو پوری بستی میں اسکا سوشل بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ کہار پانی بھرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ آپس میں لین دین، کھانا کھلانا، شادی بیاہ حقہ پانی سب بند ہو جاتا ہے۔ دھوبی کپڑے نہیں دھوتا حتیٰ کہ بھنگی تک کمانے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ وہ گاؤں میں جاتی کے کنوؤں سے تو خیر اچھوتوں کے کنویں سے بھی پانی نہیں لے سکتا ——— پھر کیسے ممکن تھا کہ مول چند گاؤں میں رہ کر زندگی گزار سکتا ——— اس سے پہلے اُسے دغا اور خیانت میں ڈیڑھ سال کی سزا ہو چکی تھی لیکن برادری نے رحم کھا کر صرف چالیس روپئے اور پنچایت کے سب پنچوں کو ایک ایک ناریل بانٹنے پر تصفیہ کر لیا تھا لیکن اب کے بار برداری کے بہت سے پنچ اُس کے سخت خلاف تھے اگرچہ وہ یہ جانتے تھے کہ مول چند مٹا مٹایا مہاجن ہے جس کے پلّے اب کوڑی بھی نہیں لیکن اُنھیں غصہ اس پر تھا کہ اس نے آخر برادری کے ہی ایک آدمی سیٹھ لکھیم چند کے مکان میں کیوں چوری کی وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ نہ اب مول چند برادری کو کھلا پلا سکیگا۔ نہ گاؤں میں رہ سکیگا اور اِس پر لے درجے کے چور سے انہیں ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی ——— جیل جا کر کوئی آدمی پوتر نہیں رہ سکتا ——— مول چند کیا کرتا۔

وہ بڑی مصیبت میں گرفتار تھا پہلے اچھی خاصی آٹے، دال، گڑ، شکر اور پرچون کی دوکان تھی لیکن ذرا سے لالچ کے سبب خیانت اور دغابازی کے جرم میں پھنس گیا تھا۔ دوکان مٹ چکی تھی دوسری بار لکھیم چند کے مکان میں اس نے اس لئے چوری کی کہ وہ اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس بات کا انتقام کہ اُس نے مول چند کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور جواب دیدیا تھا کہ وہ اُسے دوکان لگانے کے لئے ایک پیسہ بھی نہ دے گا ——— اب کیا کیا جاتا۔

ایک طرف تو برادری کا مطالبہ پورا نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ ہر طرف سے للکارا جاتا دوسری جانب اسے روٹی تک ملنا دشوار ہو رہا تھا اور تیسری جانب سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پولیس کی اس پر کڑی نگرانی تھی اُسے روزآنہ چھ میل چل کر تھانے جانا پڑتا اور اپنی حاضری لگوانی پڑتی۔ پھر یہ ضروری تھا کہ وہ روزآنہ رات کو آٹھ بجے کے بعد اپنے مکان پر موجود رہے اور جب پولیس کا گشت آئے تو موجود ملے۔ کیونکہ اگر وہ غائب پایا جاتا تو دفعہ ۱۰۹ یعنی آوارہ گردی میں پھر اُسے جیل بھیجدیا جاتا۔ اور ساڑھے چار سال جیل کی زندگی گزارنے کے بعد وہ اب جیل کے نام سے کانپتا تھا۔

آدمی کھائے پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مول چند بھی آدمی تھا۔ ہر طرف سے ٹھکرایا ہوا اور قانون کے نام پر ایسی پابندیوں کی جکڑبندیوں میں پھنسا ہوا جس سے نجات پانا دشوار تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ آخر کیا کرے ——

جب پہلے دو مہینے اسی طرح گزرے تو یہ زندگی اس کے لئے وبالِ جان ہو گئی۔ اور اس نے سوچ لیا کہ وہ تھانے کے جمعدار سے اب صاف کہدیگا کہ روزآنہ بارہ میل کا چکر اس کے بس کی بات نہیں۔ دن کا سارا وقت جس میں وہ کھانے پینے کا کوئی حیلہ، کوئی سہارا ڈھونڈسے اِسی "دوڑ پد دوڑ" میں گزر جاتے۔ پولیس اگر اب اُسے آزادی نہیں دیتی تو اچھا ہے آوارہ گردی میں اسکا چالان کر کے بھیج دے پھر جیل —— آرام سے کھانے کو تو ملے گا۔

جب مول چند نے جمعدار سے اپنی مصیبت کی داستان بیان کی تو وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا اور اس نے صاف جواب دیدیا کہ "بیٹا خالی آوارہ گردی میں ایک سال کے لئے نہیں بلکہ کسی جگہ بھی چوری کی یا نقب زنی کی کوئی واردات ہو گئی تو تمہیں کو پھانسا جائے گا۔ اور اگر آزادی چاہتے ہو تو مٹھی گرم کراؤ ——"

مول چند نے ساڑھے چار سال جیل میں رہ کر کوئی بھاڑ تو جھونکا نہیں تھا۔ وہ پولس کی رگ رگ سے واقف ہو گیا تھا اور یہ جواب اس کی اُمید کے بالکل خلاف نہ تھا اس لئے اس نے کہا "مجھے برادری نہیں ملاتی۔ دو سو روپئے ہوں تو یہ کام بنے۔ جب برادری میں مل جاؤنگا تو کچھ نہ کچھ کاروبار کر سکوں گا۔"

جمعدار نے پوچھا۔

"برادری میں ملانے سے کون انکار کرتا ہے؟"

"لکھیم چند اور اس کے کنبے والے" ——

لکھیم چند کا نام سُنکر جمعدار نے دس بیس گالیاں دیں۔ اس کی نظر میں وہ بدمعاش گاؤں کا سب سے ذی اثر اور مالدار ساہوکار اور بنیا تھا اور کسی بنج سے پولس کے قبضہ میں نہ آتا تھا۔ سپاہی سے لے کر جمعدار تک اور جمعدار سے لے کر تھانہ دار اور انسپکٹر اس فکر میں تھے کہ اُسے کسی نہ کسی طرح پھانس کر اُو سیدھا کریں ——

تھوڑی دیر جمعدار نے سوچ کر کہا "لکھیم چند۔ وہ تو بڑا پاجی ہے"

"بڑا شوم ہے" مول چند نے جمعدار کی تائید کی۔

"تو اُسے کسی طرح پھانسنا چاہیئے۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی"

"ترکیبیں تو بہت سی ہیں" مول چند بولا اُس کے ذہن میں جیل کے اندر اپنے جرائم پیشہ ساتھیوں کی بہت سی کہانیاں یکے بعد دیگرے تازہ ہو گئیں۔

"اگر کسی طرح لکھیم چند کو پھنسا دیا جائے تو ......" جمعدار نے کہا لیکن مول چند نے جمعدار کی بات کاٹ دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ذرا علیٰحدگی میں لے گیا۔

دونوں کچھ دیر کانا پھوسی کرتے رہے۔ پھر جمعدار اور مول چند دونوں نے الگ الگ اپنا راستہ لیا۔ تھوڑے فاصلے پر پہونچکر جمعدار پھر مڑا اور چلاکر بولا "یاد رکھو جتنی جلدی تم یہ کارروائی کر لوگے اتنی ہی جلدی آزاد ہو جاؤ گے۔"

مول چند نے سر ہلایا اور گاؤں کی طرف واپس چلدیا۔

تیسرے دن گاؤں میں تھانہ دار اور جمعدار اور چار سپاہی لکھیم چند کے اوسارے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دوکان کے تمام اوزان اور ترازو ضبط کر لی تھیں۔ اور گاؤں والوں کی شہادتیں قلمبند کر رہے تھے۔ مول چند بھی موجود تھا اور پولس کی خوب ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ دوپہر تک تھانہ دار صاحب

وہیں موجود رہے۔ انھوں نے لکھیم چند کے گھر کی تلاشی لی۔ سامان تتر بتر کر دیا۔ کچھ مٹی کے برتن توڑ پھوڑ ڈالے۔ تلاشی اِس قصبے میں لی گئی کہ اُس کے متعلق جاسوس نے یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ وہ جرائم پیشہ قبیلے کے لوگوں سے چوری کا مال خریدتا ہے۔ اور ادوزان اس نے منضبط کئے تھے کہ ان میں سے ہر ایک کا وزن غیر معمولی طور پر کم تھا۔ پشت پر باقاعدگی سے انھیں کھوکھلا کر کے موم بھر دیا گیا تھا۔

لکھیم چند اور اس کے گھر بار کے لوگ بے انتہا سراسیمہ تھے۔ گاؤں کو اس پر الزامات کی تفصیل جب معلوم ہوئی تو وہ بھی لکھیم چند کی بے ایمانی پر بہت برہم ہوئے۔ مگر اسے گاؤں والوں سے زیادہ اپنی عزت کا سوال اہم معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دل میں اپنے آپ کو بے گناہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن آنکھوں نے ــــــ دوسروں کی آنکھوں نے نہیں بلکہ خود اس نے جو کچھ دیکھا تھا اسے کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ اب تو وہ صاف پھنسا ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ آپس میں اس کی برائی کر رہے تھے اور کچھ دوست اور برادری والے خود اس کو ملامت کر رہے تھے۔

دوپہر کو پولیس چلی گئی اور تھانہ دار یہ کہہ گئے کہ تفتیش وغیرہ مکمل کر کے دو ایک دن میں وہ لکھیم چند کا چالان کریں گے ــــــ قدرتی طور پر لکھیم چند کو یہ فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح معاملہ رفع دفع ہو جائے ورنہ جیل کا منہ دکھائے بغیر پولس دم نہ لیگی سو دو سو پانسو ہزار تک خرچ ہو جائے تو پرواہ نہیں۔ وہ دوسرے دن خود تھانیدار کے پاس بات چیت کرنے کے واسطے جانیوالا تھا۔

شام کو سول چند لکھیم چند کے پاس آیا۔ اور اسے الگ لے جا کے اس سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا اور ملا کیا چاہئے دو آنکھیں۔ اس نے معاملہ طے کر لیا تھا۔ دو سو تھانیدار کو سو جمعدار کو، دس دس روپیہ چاروں سپاہیوں کو اور دو کو دکلدار، خود اس کو دینے پر لکھیم چند تیار ہو گیا تھا۔ لکھیم چند نے سول چند کو یہ بھی یقین دلایا تھا کہ وہ اب پنچایت میں اس کو برادری میں لے لینے پر زور ڈالیگا اور پہلے کی طرح چالیس پچاس روپئے پر معاملہ طے کرا دیگا۔ لیکن کچھ بھی ہو، بے عزتی سے اسے بچایا جائے ـــ اور سول چند نے اس کے معاوضے میں اس کی عزت بچانیکا وعدہ کر لیا تھا ــــ

دوسرے دن جب جمعدار آیا تو سول چند نے اپنی موجودگی میں لکھیم چند کا اطمینان کرا دیا ــــــ لکھیم چند اپنے گھر میں چوری کرنے والے سول چند کا بڑا شکر گزار تھا۔ اس کے نزدیک سول چند بڑا دانا اور با اثر آدمی تھا۔ چند دن کے بعد برادری کا جب پھر جوڑی تو خود لکھیم چند نے کافی جد و جہد کے بعد پہلے کی طرح چالیس روپیہ اور سب پنچوں کو ایک ایک ناریل پر معاملہ طے کرا دیا ــــــ سول چند پولس کی نگرانی سے آزاد ہو چکا تھا۔

سو ڈیڑھ سو روپیہ سے اس نے چھوٹی سی دوکان لگائی ــــــ اور لکھیم چند کی بے ایمانی کی شہرت ہو جانے کی وجہ سے گاؤں میں اس کی دوکان خوب چلنے لگی ــــــ لیکن اس کی آمدنی کا دارومدار اب صرف دوکان کی آمدنی پر ہی نہ تھا بلکہ وہ پولس کا غیر سرکاری جاسوس بن گیا تھا اور مہینے پندرہ دن میں جمعدار اور تھانہ دار کا اپنے گاؤں میں یا آس پاس کے کسی گاؤں میں کوئی نہ کوئی سٹہ ضرور کرا دیتا تھا۔ جس میں لازمی طور پر اس کا حصہ بھی مقرر تھا۔

ثاقب کانپوری

حشرِ جذبات

بڑھ رہا ہے دل میں جوشِ گریہ بیتابانہ آج
کہہ رہا ہے کون مجھ سے غم کا یوں افسانہ آج

دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہوتا ہے حشرِ اتّقا
دے رہا ہے دعوتِ حسنِ نظر بت خانہ آج

یہ محبت کی کشش تھی یا کہ جذبِ روحِ غم
آگیا پردے سے باہر حسن، بیتابانہ آج

جلوہ گاہِ ناز ہے اور اک تسلسل رقص ہے
دیکھئے کیا رنگ لائے بزم میں پروانہ آج

تا بکے ضبطِ محبت، تا بکے رازِ نہاں
سوچتا ہوں ان سے کہہ دوں دل کا افسانہ آج

پائے ساقی کے لئے بوسے وفورِ شوق میں
میکدے میں کام آئی لغزشِ مستانہ آج

کل دیا کرتا تھا اوروں کو میں درسِ معرفت
ہوگیا ہوں اپنی ہی ہستی سے میں بیگانہ آج

اب مرے اشکوں میں خونِ زندگی شامل نہیں
کیا مکمل ہوگیا ہے عشق کا افسانہ آج

عشق کا ثاقب یہی دنیا میں کیا انجام ہے
درسِ عبرت بن گئی خاکسترِ پروانہ آج

ضامن کنتوری

غزل

دل میں جو ایک شگاف سا ہے
اس رخنے سے کوئی جھانکتا ہے

وحشت کو میری نہ پوچھ ناصح
رخ دیکھ ہوا کا کیا ہوا ہے

چومے جو قدم تو کیا خطا کی
سجدہ کروں؟ بت نہیں خدا ہے

چلتی رہی سانس ہر دم
یعنی ہر کارہ تقاضا ہے

میں بھی میری وفا بھی جھوٹی
جو آپ کہیں وہی بجا ہے

ٹوٹے سب آسرے جہاں کے
مالک بس تیرا آسرا ہے

پردہ اٹھے نہ آرزو کا!!
پروردۂ دامنِ حیا ہے

پوچھے ضامن سے عشق کے راز
یہ قطرہ بحر آشنا ہے

محمود محتسب

مَعیارِ اَدب

کیا لکھا جائے، کیوں لکھا جائے اور کس طرح لکھا جائے

ہمارا زمانہ عجیب طرح کی بے چینی کا زمانہ ہے، ایک بے چینی، اور ایک بے اطمینانی ہے کہ ہر جگہ، ہر مقام اور ہر شعبۂ زندگی پر طاری ہے، یقین کی بنیادیں ہل رہی ہیں، اور زیادہ صاف لفظوں میں کہئے تو یقین کی دیواریں جا بجا سے گر چکی ہیں۔ ذرا اپنی حیاتِ انفرادی و اجتماعی پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالیئے، نظامِ معیشت میں بے چینی ہے، نظامِ سیاست میں بے چینی ہے، نظامِ اخلاق میں بے چینی ہے۔ نظامِ ادب میں بے چینی ہے، فکر میں اِنتشار ہے، عمل میں اِنتشار ہے، دماغ میں اِنتشار ہے۔ ماضی پر اِعتبار نہیں، حال پر قرار نہیں، اور مستقبل کے متعلق کسی کو کچھ نہیں معلوم

اگر واقعہ یہی ہے کہ یہ زمانہ ہی بے چینی و بے اطمینانی کا زمانہ ہے اور کوئی خیال پختہ نہیں تو تعجب کی کیا بات ہے اگر اَدب و مقصدِ ادب میں اِنتشار و بے چینی پائی جاتی ہے۔ آخر یہ ادب ہے کیا چیز؟ ہمارے ہی افکار و خیالات کا عکس تو ہے جسے اَدب کہتے ہیں، آپ چاہے اسے کسی نام سے تعبیر کریں لیکن ادب ہماری ہی دماغی و فکری پیداوار کا نام ہے —— ہیگل کہتا ہے کہ اِنقلاب افکار میں آتا ہے جس کا عکس عالمِ مادہ پر پڑتا ہے اور اِنقلاب مشہود و موجود بن جاتا ہے، کارل مارکس کی رائے میں اِنقلاب عالمِ مادہ میں رُونما ہوتا ہے اور اِنسانی افکار اس سے اثر پذیر ہو کر فکری اِنقلاب کی شکل اِختیار کر لیتے ہیں —— دونوں کا دماغ ناپختہ اور دونوں کی فکر نارسا، بیچارہ ہیگل، سوپنج بچار کا آدمی حقیقتِ حوادث کو کیا سمجھے، کارل مارکس جسے زندگی کی شناخت کبھی حاصل نہ ہو سکی، کور دماغ، کورِ فکر اور کورِ نظر ہے۔ لے دے کر اسے سارے جہاں میں نظر بھی آیا تو کیا آیا، محض مادی عمل و ردِّ عمل کا ایک سلسلۂ لامتناہی۔ یہ ہیگل کا خیال تھا۔ مارکس نے ہیگل یا دوسرے قدیم فلسفیوں کے خیالات کو مادہ پر منطبق کر ڈالا۔ اور زندگی کی تفسیر کی تو صرف اتنی کہ "زندگی غذا کے لئے ہے، اور غذا زندگی کے لئے"، چلو قصہ ختم او معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است۔

کارل مارکس یا ہیگل کے نادان پیرو بیچارے زندگی اور مقصدِ زندگی سے اتنے ہی ناواقف ہیں جتنے اندھے رنگوں سے اور بہرے راگنیوں سے، یہی وجہ ہے کہ اَدب کے مقاصد کی تعین میں یہ غلطی پہ غلطی کئے جاتے ہیں، اور جہلِ مرکب کا کمال ہے کہ ہر غلطی کو منزلِ مقصود سمجھ کر اس پر اِصرار کرتے ہیں۔

"اَدب برائے اَدب" کہنے والے کوتاہ نظر سہی، لیکن "اَدب برائے زندگی" پکارنے والے بھی تو بالغ نظر نہیں، کیوں کہ "اَدب برائے زندگی" کے بعد معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "زندگی برائے چہ؟" اس کا جواب ان کے پاس "برائے خوردن" کے سوا کچھ نہیں، اب مشکل یہ ہے کہ یہ بھی جواب شافی نہیں وہی سوال باقی رہ جاتا ہے یعنی

"خوردن برائے چہ؟" آپ پھر کہہ دیجئے کہ "خوردن برائے زندگی" ——— نتیجہ کیا نکلا؟

اَدب برائے زندگی۔
زندگی برائے خوردن۔
خوردن برائے زندگی ———؟ زندگی برائے زندگی۔

دو اور دو چار۔ کہیئے یا تین اور۔ ایک چار رہیئے، چار بہرحال چار ہی رہے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ "اَدب برائے اَدب" کی کم نظری کی اصلاح "اَدب برائے زندگی" پکارنے والے نقادوں کے بس کی بات نہیں، یہ کم سواد و دوں فطرت نقال دوسروں کے سرگم پر ناچ رہے ہیں، نہ کچھ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موران شوخیٔ طبع سلیمانے نمی آید

کچھ لوگ ہیں جنھیں دو تین سال سے اِصلاحِ اَدب کا سودا ہو گیا ہے، مگر اِن کی اصلاحات حقیقتہً خود اُن کی پیداوار نہیں بلکہ بعض روسی مُصنفین کے خیالات کی ترجمانی ہیں یہ لوگ زار کے ستائے ہوئے، اِنتقام کی آگ میں جل رہے تھے اور شدّتِ احساس نے اُن کو اس قدر نازک مزاج اور بدخو بنا دیا تھا کہ کسی معاملہ پر سنجیدگی سے غور کرنا اُن کے بس کی بات نہ تھی، گورکی نے لکھا ہے کہ ایک مسرت کی خبر سُن کر اُس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے اور دل و دماغ قابو سے باہر ہو گیا، آپ غور کر سکتے ہیں کہ اِس قسم کے "صرع اور مرگی" کا مریض بھلا اِس قابل ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ پر سنجیدہ رائے دے سکے۔ رہے گورکی کے نابینا مقلد تو اُن میں سے اکثر میں ابھی الشباب شعبۃٌ من الجنون پوری طرح کارفرما ہے۔ اور بعضوں نے بطور فیشن یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے، بقول حضرت جوش ملیح آبادی ہر نئی چیز سے تلملا اُٹھنا اچھی علامت نہیں، اسی طرح ہر پُرانی چیز سے چین بہ جبیں ہونا بھی تو کچھ اچھی علامت نہیں، ہر جدید کچھ دِنوں میں قدیم ہو جائے گا، اور ہر قدیم اپنے وقت میں جدید تھا۔ کسی چیز کا قدیم یا جدید ہونا خود اپنی جگہ پر اس چیز کی خوبی کے لئے دلیل نہیں قرار پا سکتا۔

اِن تجدد پسندوں کی زندگیاں مغربی تکلفات سے اِتنی آلودہ ہیں کہ ہندوستان کے غریب کسانوں اور مزدوروں کی زندگی سے ان کا کسی طرح مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن اِس کے باوجود اُنھیں آج تک کے تمام ہندوستانی شعراء و اُدباء پر یہ اعتراض ہے کہ اُنھیں زندگی سے واسطہ نہ تھا کیونکہ ان کے کارناموں میں کسانوں اور مزدوروں کے احوالِ زندگی نہیں ملتے اور یہ لوگ غریبوں کے غم میں تجدد پسندوں کی طرح جھوٹے آنسو نہیں بہاتے۔ اُن کا خیال ہے کہ ملک ہندوستان کا ادب اَب تک صرف دو طبقات کے اِجارہ میں رہا ہے، اولاً بیراگی تارک الدنیا اور دوم درباری مداح، اور یہ دونوں طبقے ملک کی حقیقی زندگی سے بے خبر تھے اِس لئے اب تک کا اُردو، فارسی، ہندی، سنسکرت، اور تمام اَدب درحقیقت زندگی کا عکس کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

اُن کے نزدیک زندگی نام ہے معاشی تگاپو کا، اور اُس کے سوا زندگی کا کوئی دوسرا رُخ نہیں جس کی نقاشی جس کی اصلاح اور جس کی درستگی کو اَدب کہا جائے۔ گویا اِنسان میں معدہ کے سوا کچھ نہیں، اِنسانی زندگی کے تمام پہلو معدوم قرار دیئے گئے۔

اُن کی اِس کوتاہ نظری کے متعلق تو آئندہ کچھ کہا جائے گا لیکن اِس جگہ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ "پیشہ ور ماتم کنندگانِ مزدور" حقیقتہً اپنے دل کی گہرائیوں میں غریب و فاقہ کش مزدوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھتے بلکہ مالاک سرمایہ دار کی طرح ان کا کام یہ ہے کہ بازار میں چلنے کے قابل مال تیار کر کے پیش کرتے رہیں۔ اور ہوا کے ساتھ رُخ بدل کر اپنے لئے خصوصی مقام حاصل کریں۔ اُن کی زندگیوں کا ذرا قریب سے مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ بیچارے محض

رونقِ دوکان کے لئے یہ سب کچھ کہتے ہیں ورنہ جہاں تک اُنکے اخلاق اور شئونِ حیات کا تعلق ہے، سرمایہ داری اور تکلف پسندی کی بدترین ذہنیت کارفرما ہے، لیکن اپنے فلسفۂ زندگی کے مطابق پیٹ کے دھندے میں لگے ہوئے مزدور اور کسان کی رٹ لگا رہے ہیں۔

ممکن ہے کہ اُن میں دو چار حضرات کی زندگیاں اس سادگی کی حامل ہوں جس کا پرچار اُن کی طرف سے ہوتا رہتا ہے اور واقعتہً ان کا دل مزدور اور کسان کے افلاس سے خون ہو رہا ہو۔ ایسے حضرات کا خلوص مسلم اور یقیناً ایسے حضرات اس قابل ہیں کہ ہم اُنھیں اپنی آنکھوں پر جگہ دیں اُن کو زیادہ سے زیادہ غلط فہمی اور غلط روی کا شکار کہہ سکتے ہیں لیکن کسی طرح بدنیت چالاک اور دوکاندار نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے اصحاب کی خدمت میں میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ پیشہ ور نوحہ خوانوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں، اور جو کچھ کر رہے ہیں اس پر آئندہ سطور کی روشنی میں اگر وقت اور فرصت میسر آئے تو غور فرمائیں، اُن کے قلوب صاف اور ان کی نیتیں اچھی ہیں شدتِ احساس نے اُنھیں غلط راستے پر لگا دیا ہے ورنہ ان کی قوتِ عمل سے اچھا انقلاب رُونما ہو سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے سماج اور ہمارے ادب دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے، اس سے مجھے انکار نہیں، اور میں اِس اصول کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ دنیا کو آگے بڑھنا ہے، ترقی کرنا ہے، اُسے ہر قدیم چیز کا پابند بنا کر اسکی ترقی کو روک دینا دانائی نہیں، لیکن اسے کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر جدید چیز بہتر نہیں ہوا کرتی۔ آپ میں بڑی صلاحیتیں موجود ہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا خون کر کے صرف دوسروں کی نقالی کو اپنا پیشہ نہ بنائیے۔ گورکی کا معیارِ ادب کوئی آسمانی پارسل نہیں جس میں عقل کی گنجایش نہ نکل سکے۔ حیرت انگیز امر ہے کہ مذہب کے آسمانی احکام میں عقلی موشگافیاں کرنے والے اتنے پست ہمت اور اس قدر تقلیدی ذہنیت کا مظاہرہ کریں کہ کسی گورکی یا کسی گوگن کی رائے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر تسلیم کرلیں۔

اوپر جس قسم کے "پیشہ ور نوحہ خوانوں" کا ذکر کیا گیا ہے وہ تو اس تحریر کے مخاطب نہیں ہیں کیونکہ ان بیچاروں کی کیفیت تو "قلب او مومن دماغش کافر است" کی سی ہے۔ اُن کا یہ کاروبار ہے وہ اپنے کاروبار کو ترک نہیں کریں گے۔ بلکہ اس تحریر سے صرف وہ حضرات مخاطب ہیں جو قلبِ سلیم کے ساتھ ساتھ دماغِ صالح بھی رکھتے ہوں اور جو "رونقِ دوکان" کے لئے سب کچھ کر گزرنے کو پسند نہ کرتے ہوں۔

ادب کیا ہے

ایک صحیح العقل انسان کے دل و دماغ میں مختلف جذبات و خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اُن میں سے بعض کے متعلق خود اسکا دل یا دماغ فیصلہ کر دیتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے ترک کر دیتا ہے، اور بعض کے متعلق اسے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح ہیں، اُنھیں وہ نظم یا نثر میں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہی نظم و نثر "ادب" کا نام پاتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جذبات و خیالات کی بنیاد کیا ہے، کیا یہ تمام تر ماحول کی پیداوار ہیں یا خود ماحول ان جذبات و خیالات کی پیداوار ہے، انسان کے دماغ کو حقیقتاً نہ تو تمام تر ماحول کی پیداوار کہا جا سکتا ہے اور نہ ہر انسان کو ماحول سے بالکل غیر متاثر قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہت سے خیالات اور بہتیرے جذبات ایسے ہوتے ہیں جو ماحول کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس خاص شخص کے سوا کوئی دوسرا شخص بھی اس ماحول میں ان ہی خیالات و جذبات کا حامل ہوتا اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ بلکہ تجربہ و مشاہدہ نے اس کے برخلاف نمونے پیش کئے ہیں۔ ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ ایک ہی ماحول میں دو اشخاص ہیں دونوں میں بالکل متخالف بلکہ اکثر اوقات متضاد جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا مشاہدہ ہے کہ ماحول کے اثر سے اکثر افکار و خیالات اور جذبات و تصورات کی

شکلیں بدل جاتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان تمام تر اپنے ماحول کا تابع ہے یا ہر انسان ماحول سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ذہن میں جو خیالات آتے ہیں، یا انسانی قلب میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ انسان کے خارج سے نہیں بلکہ خود اس کے اندر کہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کے جذبات و خیالات کی اصلاح کے لئے اس کے خارجی ماحول نہیں بلکہ اس کے اندرونی مرکز کی اصلاح ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض وقت خارجی ماحول کی قوت اس کی اندرونی آواز کو دبا دینے میں وقتی طور پر کامیاب معلوم ہوتی ہے لیکن اندرونی آواز کی یہ شکست دوامی نہیں بلکہ محض وقتی ہوتی ہے جو اس ماحول کے بدلتے ہی بسا اوقات خود اسی ماحول میں بھی اپنا کام کر جاتی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ ہم انسان کی اندرونی اصلاح کے بغیر صرف خارجی ماحول کی تبدیلی سے انسان کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

اسی طرح حقیقتِ اشیا صرف اتنی ہی نہیں جتنی کہ ہمیں حواس کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں یا سائنس کی علمی تحقیق سے ہم پر روشن ہوتی ہیں بلکہ ظاہری حواس سے جو علم حاصل ہوتا ہے اور سائنس سے ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کے بعد بھی حقیقتاً کسی شے کا بڑا حصہ ہم سے مخفی رہ جاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے ہم ایک اونی کوٹ کو سمجھنا چاہیں تو نظر اور سائنس کی امداد سے اون، اس کے خلیات، اور اس کی وحدات وغیرہ تک پہنچ جائیں گے لیکن کیا حقیقتاً ایک اونی کوٹ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے صرف اسی قدر سمجھ لینا کافی ہے؟ غور تو فرمائیے بھیڑوں کی جبلت جس کے ماتحت انہوں نے غذا حاصل کی اور ان کے بدن پر اون بڑھتا رہا! پھر انسان کی ذہنی کیفیات اور اس کی جبلی خاصیت جس کے ماتحت اس نے بھیڑوں سے اون حاصل کیا، اسے دھنک کر تار تیار کئے، اور پھر ان تاروں سے کپڑا اور کپڑے سے کوٹ بنا کر تیار کر لیا، یہ اور اس قسم کے ذہنی و دماغی کرشمے بغیر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا؟

بعض کوتاہ بین کہتے ہیں کہ اگر موت اور بھوک سے انسان متاثر نہ ہو شاید فراقِ یار کے علاوہ بہت کم چیزیں انسان کو دکھ دیا کریں گی۔ کتنی کوتاہ نظر اور کتنی سطحی بات ہے۔ درد یا لذّت کا سرچشمہ انسان کے باہر نہیں بلکہ اندر ہے۔ حواسِ ظاہری سے کچھ حاصل کئے بغیر بھی انسان درد یا لذّت حاصل کر سکتا ہے، اس کے لئے باہر کسی چیز کا وجود ضروری نہیں اگرچہ یہ درست ہے کہ بعض مرتبہ خارجی اشیاء کے علم سے یہ کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں، لیکن یہ کیفیتیں خارجی اشیاء کے وجود کی پابند نہیں ہیں۔ مثلاً ایک شخص ڈراونے خواب دیکھ کر درد و کرب محسوس کرتا ہے وہ بیرونی اشیاء کے وجود کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ اندرونی کیفیت کا نتیجہ ہوتے ہیں خواہ وہ کیفیت اس کے بدن کی بعض طبعی کیفیت کا نتیجہ ہو خواہ ذہنی و نفسی کیفیت کا۔

غرض کہ انسان تمام تر اپنے خارجی ماحول کا پابند نہیں۔ اور نہ ہر ایک انسان ماحول سے بالکل غیر متاثر رہ سکتا ہے ماحول انسانی ذہن کے بعض اندرونی تاروں کو چھیڑتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر انسان ماحول سے متاثر ہو جائے گا۔

ادب کیا ہے انسانی خیالات اور جذبات کی تصویریں ہو سکتا ہے کہ بعض مرتبہ یہ تصویریں ماحول کے بالکل متخالف بلکہ متضاد نظر آئیں۔ یہ محلِ اعتراض نہیں، ادب کا ماحول کے مطابق ہونا، اگرچہ ممکن ہے مگر ضروری نہیں۔

یہ کہنا نافہمی ہے کہ ادیب بھی سماج کا ایک رکن ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی تحریریں اس کے ماحول کی جیتی جاگتی تصویریں ہوں، اگر کسی نے یہی سمجھا تو یہ سمجھ لیجئے کہ اس نے انسان کو کچھ بھی نہ سمجھا۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس میں بلا کی تخلیقی و تجدیدی قابلیتیں

پائی جاتی ہیں۔ وہ صرف نقال نہیں ہے۔ وہ اپنے ماحول سے الگ ہوکر بھی سوچ سکتا ہے بلکہ سوچتا ہے، اور قدرت اس کے کام میں اس کی مدد کرتی ہے، اگر یہ صلاحیت اس میں نہ ہوتی تو شاید بہت سے ضوابط، قوانین، اصول بلکہ بہت سی ضروری اشیاء وجود میں نہ آسکتیں۔ اور دنیا ابتداء آفرینش سے اب تک ترقی نہ کرسکتی۔

اب تک ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:-

(۱) ادب انسانی جذبات وخیالات کی تصویریں ہیں
(۲) انسانی جذبات وخیالات ماتحت ہیں علم انسانی کے۔
(۳) علم انسانی کا مرکز انسان کے خارج میں نہیں بلکہ اس کے داخل میں ہے۔
(۴) خارجی ماحول حواس کے واسطہ سے مرکز علم پر ایک نہایت دھندلا سا عکس ڈال سکتے ہیں، مگر ضروری نہیں کہ جذبات وخیالات کی پیدایش کا باعث بن سکیں۔

ماحول اب ذرا ماحول کو سمجھ لیجئے، اجمالی طور پر انسان کے گردوپیش کے حالات، واقعات، حوادث، اور عام اجتماعی کیفیت کو ماحول سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں، اول قدرتی، دوم مصنوعی۔

قدرتی ماحول:- مثلاً طبعی حوادث، زلزلہ، سیلاب، بارش، آب وہوا، سرسبزی وخشک سالی اور موت وغیرہ۔

مصنوعی ماحول:- مثلاً سماج، حکومت اور معاشی کشمکش وغیرہ۔

کارل مارکس اور اس کے متبعین نے عالم شہود میں فکر وتدبر کرتے ہوئے جہاں دھوکا کھایا ہے وہ ماحول کی یہی تقسیم ہے کہ، اُن کو عالم کون وفساد میں عمل وردعمل کا ایک سلسلہ لاتناہی دکھائی دیا اور نظر آیا کہ حکمت الٰہیہ ہمہ دم کون وفساد میں مشغول ہے یہ ساری دنیا مختلف اضداد کا مجموعہ ہے، اس جگہ اُنھوں نے انسانی اعمال وافکار کو بھی اسی پر قیاس کرکے فیصلہ کردیا ہے کہ خود انسان [illegible] کے عمل وردعمل کا نتیجہ ہے اور اس کے بنائے ہوئے قاعدے، سماج، حکومت، یہ سب اسی اصول پر قائم ہیں جن میں ہمہ دم عمل وردعمل ہوتا ہے، اسی کو وہ "تاریخی مادیت" سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے مجوزہ نظام حیات کو پرانے نظام حیات کا لازمی ردعمل قرار دیتا ہے۔

لیکن ذرا اور زیادہ گہری نظر سے دیکھئے حقیقتہً ایسا نہیں ہے۔ انسان ایک صاحب ارادہ ہستی ہے وہ اتنا بے اختیار اور اس قدر ناکارہ نہیں کہ آپ اسے متحرک بلاارادہ قرار دیں، انسانی ذہن میں خود اس کے اندرونی مرکز علم سے مختلف خیالات وافکار پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ ان ہی خیالات کو اپنے اعمال کے واسطے سے عالم شہادت میں جاری کرتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر وہ سب کچھ بن کر تیار ہوجاتا ہے جسے ہم "مصنوعی ماحول" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی اعمال اُس کے یقین پر قایم ہیں خارج میں کسی حرکت میں لانے والے وجود کی ضرورت نہیں، مثال کے طور پر فرض کرلیجئے کہ آپ کو یہ بتادیا جائے کہ جس کرسی پر آپ بیٹھے ہیں اس پر ایک بچھو ہے تو اُس کا یقین پیدا ہوتے ہی آپ فوراً کرسی سے اُٹھ کر دور جا کھڑے ہوں گے، آپ کے اس اضطراری عمل کے لئے واقعتہً کرسی پر بچھو کا پایا جانا ضروری نہیں

انسان پر مختلف قسم کے علوم طاری ہوتے رہتے ہیں، ان میں اچھے علوم بھی ہوتے ہیں، اور بُرے. خیالات بھی اُسی کے ماتحت انسان مختلف اعمال کرتا ہے۔ "مصنوعی ماحول" کیا ہے آپ کے ایسے ہی علم ویقین کے ماتحت سرزد ہونے والے اعمال کا نتیجہ، اب اگر آپ کو کہیں بُرا ماحول نظر آئے تو غور کیجئے لازمی طور پر یہ برائی افراد یا جماعتوں کے عمل یا ترک عمل کا نتیجہ ہوگی کہیں اگر کسانوں کی حالت سقیم اور مزدوروں کی حالت قابل رحم

جو تو اُس کی ذمہ داری اس ملک میں بسنے والے صرف دوسرے اِنسانوں ہی پر عائد نہیں کی جا سکتی بلکہ اپنی حالت کے خراب کرلینے میں خود کسانوں اور مزدوروں کا حصہ دوسرے تمام اشخاص سے زیادہ ہوگا۔ اور جس دن ان کسانوں اور مزدوروں کی اندرونی اصلاح مکمل ہوجائے گی بیرونی اثرات انکی زندگیوں کو سقیم اور قابل رحم حالت پر رکھنے کے لئے مجبور نہیں کرسکیں گے۔ اس کے لئے دوسروں کے خلاف جنگ کی بجائے اپنی اصلاح زیادہ ضروری ہے۔ فطرت کا یہ ناقابل شکست قانون ہے کہ جرم اِنفرادی ہو تو سزا بھی اِنفرادی دی جاتی ہے اور جرم اجتماعی ہو تو سزا بھی اجتماعی ہوتی ہے اگر کوئی شخص مضر اور زہریلی غذائیں کھائے، یا صحت بخش غذاؤں سے کنارہ کش رہے تو اس کی سزا بیماری اور ضعف کی شکل میں اُس کی ذات کو بھگتنی پڑے گی لیکن اگر شہر کے تمام افراد بے فکری سے گلی کوچوں کو گندہ کرتے رہیں اور اس کی صفائی کا اِنتظام نہ کریں تو اس کی سزا بیماری اور وبا کی شکل میں پورے شہر کو بھگتنی پڑے گی۔

غرض کہ ماحول خود انسانی عمل کا نتیجہ ہے اِس لئے اس کے بُرے یا بھلے ہونے کی ذمہ داری اِنسان پر عائد ہوتی ہے، اور اس میں زندگی بسر کرنے والے ہر انسان کو جو نیکو کار ہو اس کا ہر طرح موقع حاصل ہے کہ اپنے افکار و خیالات کو ماحول کی گندگیوں سے منزہ رکھے۔ اگر اپنی ذاتی کوششوں سے ذہنی و فکری اصلاح کرتا رہے تو بہت ہی تھوڑی مشقت کے بعد اس کا یقین بہتر، اور اس کا عمل درست ہو جائے گا جس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ وہ ایک بہتر ماحول پیدا کریگا۔

کیا لکھا جائے — یقیناً ایک اُدیب اور ایک شاعر بھی اِسی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا ماحول بھی قدرتی و مصنوعی دونوں قسموں کا ہوتا ہے وہ بھی ایک اِنسان ہوتا ہے جس کے اندرونی مرکز سے مختلف علوم اُس کے ذہن پر طاری ہوتے رہتے ہیں لیکن اسے قدرت کے عطا کردہ اِس ملکہ کی قدر کرنی چاہیئے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حساس قلب اور دوسروں سے زیادہ فکر رسا رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اپنے قلب و دماغ کی اندرونی اِصلاح کرے تاکہ بُرے خیالات اور پریشان افکار اس کو اپنی طرف متوجہ نہ رکھ سکیں، اس طرح اس میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز پیدا ہو جائے گی، اور وہ اچھی طرح سمجھ سکے گا کہ اس کا کون جذبہ اس قابل ہے جس کی تصویر اس کی طرح کے دوسرے انسانوں کو مقصد زندگی کی طرف متوجہ کرسکے گی۔ اور کون جذبہ اس کا نفسانی دہوکہ ہے جس کی زناشی اس کے لئے اور اس کی طرح کے دوسرے اِنسانوں کے لئے غیر مفید بلکہ مضر ہوگی۔

"ادب برائے زندگی" کی رٹ لگانے والے نہ صرف کوتاہ نظر اور کور دماغ ہیں بلکہ بڑی حد تک غیر منطقی اور مہمل بکواس کرنے کی وجہ سے حقیقۃً پاگلوں کی صف میں بٹھائے جانے کے قابل ہیں۔ "نہ ادب برائے ادب" صحیح ہے اور نہ "ادب برائے زندگی"؛ الفاظ اگرچہ مختلف ہیں لیکن معنًا ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ "ادب برائے ادب" کہیئے تو مقصود صرف ادب رہ جاتا ہے؛ دوسرے لفظوں میں زندگی کی علت غائی ادب قرار پاتا ہے، اگر یہ صحیح ہو تو پھر ادب کی علت غائی تلاش کرنیکا مرحلہ سامنے آئے گا، اور کون ہے جو زندگی ہی کو پھر اسکی علت نہ قرار دے۔ نتیجہ کیا نکلا دہی ادب برائے زندگی اور زندگی برائے اُدب، اس مہمل دوریہ سے کبھی نجات نہ ملے گی۔

ذرا عقل سے کام لیجئے اور غور فرمائیے جیسے علت فاعلی میں ایک ربط و تسلسل پایا جاتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ایک چیز دوسری سے اور دوسری تیسری سے وجود میں آتی ہے یہاں تک کہ کسی علۃ العلل پر یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے،

بالکل اسی طرح علت غائی میں بھی تسلسل و ربط پایا جاتا ہے گلاس پانی پینے کے لئے، اور پانی پینا پیاس بجھانے کے لئے، پیاس بجھانا زندہ رہنے کے لئے اور زندہ رہنا اس اصل غایت کی تکمیل کے لئے جو مقصد تخلیق ہے۔

ذرا غور تو فرمایئے کہ آفتاب کے وجود کا ایک مقصد ہے، ماہتاب کے وجود کا ایک مقصد ہے، پانی، ہوا، مٹی، غرض کہ دنیا کا ذرہ ذرہ کسی نہ کسی مقصد کی تکمیل کے لئے ہے لیکن انسان سب سے بہتر، سب سے زیادہ ترقی یافتہ مخلوق بالکل بے ضرورت تو نہیں ہے؟ آپ کی تجدد پسندی اگر اجازت نہ دے تو خدا کے نام سے کام نہ لیجئے لیکن یہ کیا بزدلی ہے کہ یہاں پہنچکر بات ٹال جائیے عقل انسانی کو اتنے بڑے مسئلہ پر طفل تسلیوں کے ذریعہ خاموش نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی پڑے گا۔

نہایت ہی درد کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ سماج غریبوں پر ظلم کر رہا ہے، سرمایہ دار مزدوروں کا خون چوس رہے ہیں۔ دنیا میں جنسی تشدد جاری ہے عورتیں مردوں کو اور مرد عورتوں کو اپنے خواہشات نفسانی کے خونی دیوتا کے سامنے بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کون کر رہا ہے، آخر انسان ہی تو کر رہا ہے، اگر زندگی اور فراغبالی بغیر کسی اور بلند مقصد کے خود مقصد ہے تو یہ سب کیوں نہ ہو، کیوں نہ ایک غریب گر مضبوط طالب علم اپنی فراغبالی اور مسترت کے لئے کسی وائس پرنسپل کو کرسی پر سے جبراً اتار کر اُن سے اپنے گھر کی چھپر بندھوائے؟ اور کیوں نہ لونڈا ایک غریب مزدور فلم کمپنی کے کسی سکالہ نگار سے اپنا بوجھ اٹھوا کر آرام کی نیند سوئے؟ کیوں دنیا میں کوئی اس قدر بے وقوف بنے کہ انفرادی فراغبالی اور پر مسرت زندگی کو اجتماع کی فلاح کے لئے قربان کر دے، آخر اس حماقت سے فائدہ؟

نوجوانو! ہم تم سے درخواست کرتے ہیں، انسانیت کو درندگی اور چوپایہ گی کے اس ذلیل مقام سے بچاؤ، جہاں یہ کم عقل اور دون فطرت "ادب برائے زندگی" پکارنے والے تمہیں لئے جا رہے ہیں، وسعت قلب اور وسعت نظر کے ساتھ زندگی اور ادب دونوں کا حقیقی مقصد تلاش کرو ــــ زندہ رہنے کے لئے تمام اسباب مہیا کرو، اس میں کوتاہی نہ ہونے پائے، آسمان و زمین کی ہر چیز کو اپنا خادم بنالو، اس سلسلہ میں ہر رکاوٹ کا مردانہ وار مقابلہ کرو، لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ ہونے دو کہ اس ساری تگ و دو کا مقصد زندہ رہنا ہے اور زندہ رہنے کا مقصد خود زندگی سے بھی بلند تر کچھ اور ہے۔ ادب کو اپنی زندگی میں ایک خادم کا مقام دو، "ادب برائے ادب" کا نعرہ لگا کر اسے مخدوم و مقصود کا مقام نہ دیدو۔ قوم وطن، اور نسل و زبان کی خطرناک تقسیموں کو ختم کر کے سارے جہاں کو انسانوں کی ایک ہی بستی سمجھو، ہر انسان کی خدمت کرو، اپنے ادب کو اس رنگ میں ڈھالو کہ جس سے انسان کے ایسے شریف جذبات بیدار ہوں لیکن یہ یاد رکھو کہ ادب یا زندگی کا مقصد بنی نوع انسان کی خدمت بھی نہیں ہے بلکہ یہ خدمت خود ایک راستہ ہے جس کے ذریعہ مقصدِ حیات تک پہنچا جا سکتا ہے۔

ادب اور زندگی کا مقصد کیا ہے، اس کا جواب کارل مارکس، ہیگل، یا نیٹشے کے ہاں نہیں مل سکتا یہ خود گم کردہ راہ ہیں۔ تمہارے یہ دون فطرت نوجوان جو افسانوں میں جنسی تشدد کے نقشے کھینچکر دوکان کی رونق کا سامان مہیا کرتے ہیں نہایت درجہ کوتاہ بین اور نقال ہیں یہ تمہیں کچھ نہیں بتا سکتے۔ معمولی طور پر اپنی اندرونی اصلاح کے بعد تم پر خود روشن ہو جائے گا یقین کی استواری اچھے اعمال کی پابندی اور وسعت قلب کے ساتھ محبت میدان زندگی میں ہر جگہ تمہارے کام

آئے گی۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

کیا لکھا جائے تو واضح ہو چکا، اس مقصد عالی کو سامنے رکھ کر تمہارا قلم، تمہاری زبان اور تمہارا دماغ تمام تر خالق کائنات کی رضا کے لئے کام کر رہے ہیں، یقین کے استحکام، عمل کی نیکی، اور محبت کی وسعت کے لئے لکھو، بولو، اور سوچو

اب دوسرا سوال

کیوں لکھا جائے

خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اپنی اندرونی اصلاح کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اندرونی اصلاح کے لئے آمادہ کیا جائے۔ اگرچہ اس خیال کو بھی صرف مقصد قریب کا مقام حاصل ہے، اسے علت غائی یا آخری و انتہائی مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن آخری مقصد تک پہنچنے کا راستہ قرار دیا جا سکتا ہے اس لئے لکھنے والے اس کے ماتحت کام کریں اور ایسا ادب پیدا کریں جو لوگوں کو ان کی اندرونی اصلاح پر آمادہ کر دے، اس کے لئے افسانہ، ڈرامہ، نظم، غزل، قطعہ، مثنوی، موجودہ اور آئندہ پیدا ہونے والے تمام اصناف ادب پر قلم فرسائی جائز ہو سکتی ہے۔

اس جگہ ایک اہم نکتہ نظر انداز نہ ہونے پائے کہ دوسروں کو اندرونی اصلاح پر آمادہ کرنا صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ خود ادیب و شاعر اپنی اندرونی اصلاح کی طرف پورے عزم کے ساتھ متوجہ ہو، ورنہ ساری کوششیں رائے گاں ہو جائیں گی۔

ذہنی انقلاب پیدا کرنے والے گروہ اور اس کے ہر ایک فرد کی زندگی پہلے خود انقلاب پذیر ہوتی ہے۔ چاہے وہ انقلاب خیر سے شر کی طرف ہو یا شر سے خیر کی طرف، ورنہ عمل کے فقدان سے ساری لسانی محض سخن سازی رہ جاتی ہے اور کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر روسی انقلاب کے زعما کو دیکھئے، ہندوستان قدیم میں مہاتما بدھ اور ان کے ساتھیوں کو دیکھئے، اور اسلام میں صحابہ، اور صلحاء کی جماعت پر نظر ڈالئے۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ انسان کان کی بجائے آنکھ سے زیادہ اثر لیتا ہے۔ اسی طرح قلبی یقین کے بغیر جو بات زبان سے نکلتی ہے وہ سننے والوں پر اثر نہیں کرتی۔

کس طرح لکھا جائے

یہ سوال کہ کس طرح لکھا جائے، کچھ زیادہ گنجلک سوال نہیں، صاف اور واضح الفاظ میں لکھئے اور ایسا انداز تحریر اختیار کیجئے جس میں تصنع اور بناوٹ نہ ہو۔ اصول سے اختلاف کرنے والوں کے حق میں بہت زیادہ نرم اور غیر فیصلہ کن الفاظ کا استعمال نہ صرف ایک قسم کی منافقت ہے بلکہ خود صاحب تحریر کے ذہنی انتشار اور قلبی تذبذب کو ظاہر کرتا ہے اصول کے معاملہ میں کسی کو معاف نہ کیجئے اور نہایت سختی کے ساتھ ذاتی اعمال و افکار کا جائزہ لے کر گندم نما جو فروشوں کی بے حجاب تصویریں اہل نظر کے سامنے رکھ دیجئے۔

زبان مشکل اور بعید الفہم استعمال کرنا اچھا نہیں لیکن "دیہاتیوں کی زبان" کی طرف بلانے والوں کے شور و غوغا سے کوئی اثر نہ لیجئے۔ دنیا کی کسی زبان میں "ادبیات عالیہ" کی زبان دیہاتیوں کی زبان نہیں ہوتی، اور نہ کوئی بڑا سے بڑا صاحب قلم دقیق مضامین کو عوام کی زبان میں ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کون نادان کہہ سکتا ہے کہ عربی، انگریزی، فرنچ، روسی اور جرمن زبانوں میں علمی کتابیں عوام کی زبان میں لکھی جاتی ہیں۔ یہ معمولی سا فرق جو علمی زبان اور عوام کی بولی میں پایا جاتا ہے، بہر حال باقی رہے گا۔ اسے باقی ہی رہنا چاہیئے۔ اگر اس فرق کو مٹا دینے کی کوشش کی گئی تو زبان سے اعلیٰ مضامین کے ادا کرنے کی صلاحیت مفقود ہو جائے گی۔ ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں کہ تحریر کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنانے کی سعی جاری رہے نہ تو اسے اردو کی بجائے، عربی و سنسکرت بنا دیا جائے اور نہ بالکل "طوطا مینا کی کہانی" ہو کر رہ جائے۔

ادارۂ اشاعت اردو کی مطبوعات

	پائے	آنے	روپے
مقالات محمد علی حصہ اول مرتبہ رئیس احمد جعفری	۰	۱۲	۴
مقالات محمد علی حصہ دوم مرتبہ رئیس احمد جعفری	۰	۱۲	۳
افسانے اور ڈرامے۔ از سعادت حسن منٹو	۰	۱۲	۲
گرداب۔ از احمد ندیم قاسمی (افسانے)	۰	۱۲	۳
لہریں۔ از ڈاکٹر شفیق الرحمن (افسانے)	۰	۱۲	۳
زندگی کے نئے زاویئے۔ از جعفری (افسانے)	۰	۰	۳
مضامین عبدالماجد دریابادی۔ حصہ اول	۰	۴	۴
رئیس الاحرار محمد علی مرحوم از مولانا عبدالماجد دریابادی	۰	۱۲	۲
مردوں کی مسیحائی۔ از مولانا عبدالماجد دریابادی	۰	۱۲	۳
یقین وعمل۔ مترجمہ عبدالقدوس ہاشمی	۰	۸	۲
ٹیگور اور انکی شاعری۔ از مخدوم محی الدین ایم۔اے	۰	۸	۱
جمہوریہ چین۔ از میر عابد علی بی۔اے	۰	۱۲	۱
روح اقبال۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۰	۴	۴
نغمات ماہر۔ از ماہر القادری	۰	۰	۳
محسوسات ماہر۔ از ماہر القادری	۰	۰	۳
رنگ محل۔ از ساغر نظامی	۰	۱۲	۳
اقبال کا تصور زمان ومکان۔ از ڈاکٹر رضی الدین	۰	۱۲	۰
ابن خلدون کے سیاسی ومعاشرتی نظریئے۔ از پروفیسر عبدالقادر		۶	۰
سیاست جاپان۔ از علی امام بلگرامی	۰	۱۰	۰
اقبال کے خطوط جناح کے نام۔	۰	۵	۰
کاروان علم۔ مرتبہ بادشاہ حسین وفیض محمد صدیقی	۰	۰	۳
ادب اور انقلاب۔ از ڈاکٹر اختر حسین رائپوری	۰	۸	۳

ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد (دکن)

ہماری اِس ماہ کی نئی کتابیں

اَفسانے اور ڈرامے:۔ از سعادت حسن منٹو

منٹو اپنا "دھواں" دُور کرتا ہے۔ اور ایک دلکش ہوئی تصنیف پیش کرتا ہے۔
ڈرامے جن میں اَفسانوں کا سکون اور اَفسانے جن میں ڈراموں کا ہیجان بھی موجود ہے
مجلد۔ رنگین ٹائیٹل بہترین کتابت وطباعت۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

مقالاتِ محمد علی مرحوم حصہ اوّل و دوم

مرتبہ:۔ رئیس احمد جعفری

ہندوستان کا آتش نوا زعیم جب تک زندہ رہا اپنی شعلہ سامانیوں سے محفل کو لذت سوز سے، لطف تپش سے، جلنے اور جلتے رہنے کے کیف سے روشناس کراتا رہا۔ اُس نے تقریریں بھی کیں اور مضامین بھی لکھے اس کی زبان آب رواں کی طرح چلتی تھی۔ اس کا قلم شمشیر خارا شگاف کا کام دیتا تھا۔

محمد علی مرحوم کے سوانح نگار **رئیس احمد جعفری** نے بڑی عرق ریزی اور دیدہ کاوی سے یہ مجموعے مرتب کئے ہیں۔ آج ہی آرڈر دیجئے۔ ورنہ ممکن ہے آپ کو دوسرے ایڈیشن کا اِنتظار کرنا پڑے۔ قیمت فی حصہ تین روپئے بارہ آنہ مجلد۔

معاشیات اور پاکستان:۔ از عبد القدوس ہاشمی۔

پاکستان اور ہندوستان کے مصنف عبد القدوس ہاشمی کی معرکتہ الارا تصنیف جس میں سرکاری اِعداد وشمار سے ثابت کیا گیا ہے کہ پاکستانی حکومتوں کی مالی و معاشی حالت دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں سے بہتر ہوگی۔ قیمت:۔ ڈیڑھ روپیہ۔

ابن خلدون کے سیاسی و معاشی نظریے۔

پروفیسر عبد القادر صاحب کا نہایت علمی و تحقیقی مقالہ۔ قیمت:۔ چھ آنے

اِدارۂ اِشاعت اُردو۔ عابد روڈ حیدرآباد (دکن)

احمد ندیم قاسمی

جوانی کی سڑاند

ایک خط

نصیر بھیا۔

جب سے تمہارا خط ملا ہے، ایک عجیب و غریب سوچ کے دھندلکے میں ٹامک ٹوئیے مارتا پھر رہا ہوں۔ یہ درست ہے، کہ اتنے عرصے تک اکٹھے رہنے سے تم میری افتاد طبع کی گہرائیوں تک ہو آئے ہو لیکن اس خط میں تم نے میری جس کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ایک مدت تک خود مجھ سے پوشیدہ رہی اس سے تمہارا واقف ہونا خوارق میں شامل ہے، آخر تم نے یہ کیسے معلوم کیا کہ میری محبوبہ میرے خیالوں کی دیوی ہے، جس نے دنیا کی بے شمار دیویوں کا روپ دھارا، لیکن کسی ایک میں بھی مجھے اپنے تصور کی وہ جنت نہ مل سکی، جو ابتدائے شباب میں میرے تازہ خون سے سیراب ہوتی رہی، اور اب اسی خون کی سڑاند سے کہاد حاصل کر رہی ہے!

تم نے میری دکھتی رگ پہچان لی ہے تو میرا ریاکاری سے کام لینا بے معنی اور لاحاصل ہے، تم مجھے بے حد عزیز ہو، اس لئے اعتراف کئے لیتا ہوں لیکن یہ اعتراف صرف تم تک محدود رہے، میں اسے عام نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ اس طرح میری مردانگی کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے!

مجھے جوان بنانے میں خونِ تازہ کا اتنا حصہ نہیں جتنا میرے تخیل کا۔ وہ مانگے تانگے کا تخیل جو غیر ملکی ادیبوں اور شاعروں نے میرے دل و دماغ میں ٹھونسا تھا۔ یہ "ٹھونسا" کا لفظ عبارت آرائی کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ کالی داس، فیضی، غالب اور اقبال کا ہم وطن جب شیکسپیر اور شیلے کے اشعار پڑھنے پر مجبور کیا جائے گا۔ تو یہی سمجھو کہ تربوز کے چھلکے اس کے گلے میں ٹھونس دیئے گئے ——— اس مانگے تانگے تخیل نے میرے جسمانی تقاضوں پر اپنی برفیلی گرفت جما دی اور میری رگوں کی خوابناک جھرجھری کو کرب آمیز بھڑکن میں بدل دیا۔

یہ زمانۂ تعلیم کا واقعہ ہے، ان دنوں ہم انگریزی شاعری کے رومینٹک دور میں سے گزر رہے تھے، ورڈز ورتھ کی نظمیں پڑھ کر اچانک میرے دل میں ایک لطیف سی کرید نے گھر کر لیا ——— کسی لیوسی کی تلاش ——— اس معصوم لیوسی کی جس نے ورڈز ورتھ کے خیالوں پر پاکیزگیاں چھڑک دیں، اور جو ازل کار پاک اور عفیف فطرت کا جزو غیر محسوس بن کر رہ گئی، ہوسٹل کے کمروں میں لیوسی کہاں ملتی! سیاحوں کی طرح میں نے شہر کے آس پاس دیہات کے چکر لگائے۔ لیکن نصیر بھیا۔ دیہات کی گلیوں میں کوڑے کے ڈھیر، بھٹے ہوئے پیٹیوں اور گھٹے ہوئے سینوں والے کلموہے بچے ——— گری پڑی دیواریں ——— تالاب کے پانی پر مویشیوں کے گوبر تیرتے ہوئے! ———

طبیعت بھا گئی!

یہاں ہوسٹل میں ایک روز نائب باورچی کے ساتھ اس کی لڑکی بھی آنکلی کوئی دس گیارہ برس کا سن سانولا سا چہرہ ——— صاف آنکھیں ——— موٹی تازی میں نے پوچھا "تو کس کی لڑکی ہے؟" ——— کہنے لگی "اپنے باپ کی!"

میں نے کہا "اگر میں تجھے اپنی بچی کہوں؟" ——— بولی "ہٹ!" ——— نائب باورچی خوفناک دیکھے میں مجھ بجا رہا تھا: یہ باتیں سن کر زور سے ہنسا۔ اور بولا۔ "گلزار۔ تو ان بابوجی کی بھی بچی ہے۔ سمجھی؟ ——— بڑے اچھے آدمی ہیں یہ بابوجی" ——— گلزار نے مجھے حیرت اور اُنس کے ملے جُلے جذبات سے دیکھا تو میں نے اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھدیا کھلکھلا کر ہنس دی اور روپیہ اپنے باپ کے حوالے کر کے دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی، میں ایک بار کمرے سے باہر آیا۔ تو مجھے دیر تک دیکھتی رہی۔ اور جب میں نے اُس سے پوچھا "گلزار تو کل بھی آئے گی نا؟" تو باپ بیٹی ہم زبان ہو کر بولے "ہاں ہاں!"

اُس روز میں نے ورڈز ورتھ کی نظموں کو اتنے غور سے پڑھا، کہ شاید ہی کبھی اتنے غور سے پڑھا ہو، کیٹس میاں تو نرے لفنگے نظر آنے لگے، خواہشات نفسانی کے غلام ——— جنھیں صنفِ لطیف کے دہکتے سینے اور تپتی انگلیوں کے ذکر کے بغیر اطمینان ہی میسّر نہ آیا۔ مقدس ورڈز ورتھ کے اِس گہرے مطالعہ سے لیوسی کا الوہی تصور، میری نس نس میں سرسرا اُٹھا اور میں دوسرے روز گلزار کا یوں انتظار کرنے لگا جیسے میں شاعر ہوں، اور کسی برفانی سلسلۂ کوہ میں لیوسی کے قدموں کے نشانات کا متلاشی ہوں!

اور آخر گلزار آئی ——— اور پھر وہ ہر روز آنے لگی! کالج کے لڑکے میرے عجیب و غریب رویئے کے متعلق خیال آرائیاں کرنے لگے بہتوں نے مجھ پر پھبتیاں بھی کَسیں۔ لیکن گلزار کا سانولا چہرہ۔ صاف آنکھیں اور گدگدا بدن میرا سہارا بنا رہا۔

اور ایک روز ——— معاف کرنا نصیر بھیا اقبالی مجرم پر تہذیب کی کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی ——— ایک روز جب گلزار میرے کمرے میں آئی۔ تو جانتے ہو میں نے کیا کیا؟ اس کے گال چھو لئے۔ وہ بھڑک اُٹھی تو میں نے اسے اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ "بابوجی۔ یہ بھی کوئی مذاق ہے!" وہ چلائی۔ لیکن میرے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ کنپٹیاں بج رہی تھیں اور رگوں میں ایک لذیذ سی کپکپی پیدا ہو گئی تھی ——— اچانک نائب باورچی میرے کمرے میں آنکلا۔ نتھنوں کی کی پھڑکن اور رگوں کی کپکپی دل کی دھڑام دھم میں بدل گئی۔ وہ شور مچا کر میدان جنگ کے غلغلے مانند پھٹتے وہ بولا۔ "دیکھو بابوجی۔ یہ لڑکی یتیم نہیں۔ ابھی اس کے ماں باپ جیتے ہیں، مر گئے ہوتے تو آپ اِس سے کھیلتے۔ پر اب تو آپ نے ظلم کر دیا!"

ہراساں گلزار اپنے باپ سے چمٹی جا رہی تھی۔ سامنے دیوار پر کلنڈر کی تصویر کو میں نے منہ بناتے دیکھا۔ ورڈز ورتھ کی کتاب پنجرے میں بند چوہے کی طرح میری الماری میں اچھلنے لگی۔ اور میں دیر تک سر کے بل کھڑا پہاڑوں پر برف کو پگھلتے اور نازک پاؤں کے نشانات کو مٹتے دیکھتا رہا ——— حیرت کی کوئی بات نہیں۔ دراصل مجھے محسوس ہی یونہیں ہوا تھا۔

اور اس کے بعد میں نے سوچا۔ جب میرے پاکیزہ خیالات اچانک نفس کی بے مایہ سی پھریری تلے دب گئے۔ تو میاں ورڈز ورتھ کہاں کے ولی تھے، یقیناً انہیں بھی کسی ایسی ہی لیوسی سے ایسے ہی حالات میں سابقہ پڑا ہوگا ———، اور نصیر۔ میں نے

دوسرے روز سورج کو مغرب سے نکلتا دیکھا ——
میرے لئے ساری کائنات قلابازی کھا گئی تھی!

میں اکثر اس خیال میں غرق رہتا ہوں کہ انسان کے احساسات پر اتنی پابندیاں کیوں ہیں! اور اگر یہ پابندیاں ناگزیر تھیں۔ تو قلب میں احساسات کی قوت کی کیا ضرورت تھی۔ کیا یہی بہتر نہ تھا کہ انسان ایک فولادی ڈھانچہ سا ہوتا ہے۔ جو مل گیا کھا لیا۔ جس طرف کا رُخ ہوا چل دیا۔ یہ تہذیب و تمدن۔ قانون و رواج کے گورکھ دھندے انہیں جذبات کے قتلِ عام کے لئے تخلیق کیئے گئے ہیں۔

میں نوجوان تھا۔ اُنیس بیس برس کی عمر میں جوانوں نے جو بغاوتیں کی ہیں۔ اُن سے تاریخِ عالم بھری پڑی ہے' میری بغاوت نفسیاتی سہی' لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا' میں جو کچھ کرتا تھا وہ ایک مجبوری کا کرشمہ تھا۔ طویل راتوں میں لذت ناک انگڑائیاں جب میرے ریشے ریشے میں غنودگیاں بھر دیتیں۔ تو میں خدا جانے کیسے کیسے ارادے کرتا۔ ایک رات میں نے کشمیر جانے کا تہیہ کیا۔ تو میں دوسری رات جزائر ہوائی میں جانے کا۔ قلب کی تسکین کا سامان ہندوستان میں ناپید تھا۔ اور میرا قلب تسکین کا پیاسا تھا۔

میں نے ہوسٹل چھوڑ کر شہر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ اور وہاں سامنے کے ایک دریچے میں مجھے تسکین کی ایک جنت نظر آئی۔

کئی دنوں تک تو میں کتاب پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ جرأت نہ ہوئی ادھر دیکھنے کی۔ سچ کہتا ہوں نصیر ان دنوں میرے سارے جسم پر آنکھیں پیدا ہو گئی تھیں نظر اُٹھائے بغیر مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ دریچہ کھلا ہے اور ساڑی کا ایک گستاخ پلّو بار بار ایک گورے ہاتھ سے سنبھالا جا رہا ہے' کتاب کے حروف میں جنگ چھڑ جاتی الفاظ الفاظ پر چڑھ کر ناچنے لگتے' سطریں ٹیڑھی بینگی ہو کر گھناؤنے کیڑوں کی طرح رینگنے لگتیں میرے دل و دماغ میں بھی عجیب سی جھرجھری پیدا ہو جاتی۔

اور جب میں نے ایک روز اسے دیکھا۔ تو کھڑاک سے کھڑکی بند کر دی گئی۔ ساڑی کا ایک پلّو باہر لٹکتا رہ گیا۔ اور پلّو چھڑانے کے لئے کھڑکی کو اس احتیاط سے نیم وا کیا گیا کہ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔

اس کے بعد دریچہ مر گیا۔ جب دریچہ ہمیشہ بند رہے تو اس میں زندگی کی تلاش بے سود ہے' کیونکہ دریچے کھلنے اور کھلے رہنے کے لئے بنائے جاتے ہیں'۔

میں ادھر جھانکا۔ اُدھر جھکا لیکن کچھ نہ پا سکا۔ اِس جنتِ گمشدہ کے متعلق میں یہی سوچتا رہا۔ کہ یا تو میرے دیکھنے کا انداز گستاخانہ تھا۔ یا میری ناک اِس قدر لمبی ہے کہ وہ میرے گول چہرے کا ستیاناس کر دیتی ہے' یا دریچے والی بی بی شادی شدہ ہیں!

ایک روز میں اسی مکان کی پرلی طرف ایک الماری کھولے کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا کہ الماری کی پشت میں ایک جھری سی پیدا ہو گئی۔ جھک کر دیکھا تو ملحقہ مکان کا ایک آراستہ پیراستہ کمرہ نظر آیا۔ ایک تکیے پر ایک بھرا بھرا بازو بھی دکھائی دیا۔ جس کی گولائی بتا رہی تھی۔ کہ یہ بازو مرد کا نہیں۔ کھانسنے کی کوشش کی تو بازو حرکت میں آیا۔ اور پھر ایک عورت کے سر کا پچھلا حصہ دکھائی دیا۔ وہ عورت شاید میری کھانسی کی سمت کو متعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں پھر کھانسا۔ اور کتابوں کو الماری میں اُلٹا پلٹا تو وہ اُٹھ کر جھری کے بالکل قریب آ گئی' میں ایک طرف ہٹ گیا۔ اور جب کچھ دیر کے بعد الماری کے سامنے آیا تو جھری غائب تھی! شاید دوسری طرف بھی الماری تھی' جس کے پٹ بند کر دیئے گئے تھے!

الماری کے پٹ تو بند ہو گئے' مگر دل کے پٹ

کمل چکے تھے۔ وہی لطیف کریہ اور وہی لذت ناک بے چینی۔
جانے کیا اتفاق ہوا کہ میری روزانہ ضرورت کی بے شمار چیزیں
کھسک کر اُسی الماری میں آ دبکیں، لمحہ لمحہ بعد اُسے کھولنے
کی ضرورت پیش آتی۔ اور پھر وہاں دیر تک کھڑا نہ رہا جا سکتا
پنسل اُٹھائی۔ جھری کو دیکھا اور پیچھے کو کسی نے جکڑ دیا۔ پلٹ کر
پلنگ پر آیا تو کاغذ لینے پھر الماری کا رُخ کیا۔ کاغذ اٹھا کر میز
تک آیا تو قلمتراش کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ اور وہ کمبخت بھی الماری
میں جھری کے قریب ہی ملا!

ایک روز میں نے جھری کی طرف دیکھا تو اندھیرا تھا
الماری یقیناً بند تھی۔ اِس لئے جھری کو دیکھتے رہنے میں
کوئی مضائقہ نہ تھا۔ صرف اِس لئے کہ شاید اِس جھری کے
مقابل کوئی اور جھری ہو۔ اور اُس جھری کے مقابل پلنگ
ہو، اور اِس پلنگ پر مجھے وہ سڈول بازو نظر آ جائے۔
جو وینس کے ٹوٹے ہوئے بت سے چپکا دیا جائے تو
سنگ تراشی کا فن منہ تکتا رہ جائے۔ آخر یہ دُنیا
اِتفاقات ہی سے تو قائم ہے، اور خاص کر یہ محبت کے
سلسلے تو اتفاقات کی پیداوار ہیں، اور نصیر بھیّا۔ یقین مانو
اتفاقاً مجھے کافی کوشش کے بعد اِس جھری کے مقابل
ایک اور جھری نظر آ گئی۔ جو اگرچہ مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔
لیکن تھی بہت کھلی اور گول! اور پھر سامنے پلنگ بھی نظر
آ گیا۔ اور اُس پلنگ پر وہ سڈول بازو بھی!۔

میں کھانسا تو بازو اژدہے کی طرح اُبھر گیا۔ میں نے
کھانسی کو طول دیا تو بازو والی صاحبہ اُٹھیں۔ اور ایک
طرف سے ہو کر جھری کے مقابل آ گئیں۔ مجھے اُن کی ایک
آنکھ نظر آئی! —— جھری میں سے جھانکتی ہوئی
—— اور نصیر۔ تمہیں کیا بتاؤں اس آنکھ کی اتھاہ
گہرائیوں کی داستانیں! حسن اور خمار کا ایک ٹھاٹھیں
مارتا ہوا سمندر رہتا تھا جو پلکوں کے اُس طرف اَبدیت
کا متشکل نمونہ بن کر رواں دواں تھا۔ شاید وہ بھی میری
ایک ہی آنکھ دیکھ سکتی تھی۔ اِس لئے میں نے اپنی آنکھ کو

کھینچ تان کر بڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر بُرا ہو اس عینک کا۔
الماری پر کسی پہلو جمتی ہی نہ تھی۔ عینک جمتی تو آنکھ کا زاویہ
ٹیڑھا پڑ جاتا اور بصارت لڑکھڑا جاتی۔ اور اگر آنکھ کا زاویہ
ایک پل کے لئے دُرست ہو جاتا تو عینک ایک طرف
کھسک جاتی!

"محبت آنکھوں سے پیدا ہوتی ہے"۔ دوتی کے
ایک ضخیم ناول کا یہ فقرہ مجھے یاد تھا۔ اس لئے تسلی تھی
کہ محبت کا بیج بویا جا چکا! اُس روز میں نے خدا جانے کتنے
مرتبہ الماری کھولی، اللہ کتنے مرتبہ آنکھ سے آنکھ ملی۔ اور
پھر شاید دسویں پھیرے پر الماری کھل گئی۔ اور پالش
کئے ہوئے دو ناخنوں نے جھری کے قریب آ کر کاغذ کا
ایک پُرزہ میری الماری میں گرا دیا۔ لکھا تھا "اگر تم نے
زندگی کے دوسرے مرحلوں میں بھی یونہی تساہل سے
کام لیا تو ناکام رہو گے۔ مقصد سامنے ہو تو آگے بڑھو۔
لپکو جھپٹو اور منزل پر پہنچ جاؤ —— تم سوچ کیا رہے ہو؟"
اب سوچنے کی مہلت کہاں! جھری میں چاقو ڈال کر
میں نے لکڑی کا ایک ہاتھ بھر ٹکڑا کاٹ کر وہ پھینکا اور جب
سامنے دیکھا تو —— نصیر بھیّا —— مجھے
جذباتی نہ کہنا —— حقیقت بیان کر رہا ہوں! ——
میں نے جب سامنے دیکھا تو ایک ڈائن کو مسکراتے
پایا۔ دیسی صابن کی ٹکیا ایسے ہونٹ اور اسّی کینڈل
پاور کے نتھنے ایسی ناک! یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں
کے نیچے کرکٹ کی گیند چپکا دی گئی ہے! آنکھیں خوبصورت
تھیں مگر اِس ماحول میں وہ بھی سمٹ کر رہ گئی تھیں۔
میں کھسیانہ ہو کر مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی۔ اور
سونے کے تاروں میں جکڑے ہوئے اُس کے پیلے چوڑے
دانت جھلملا اُٹھے۔ اس نے رخنے میں ہاتھ ڈال کر
میری ایک کتاب اُٹھالی۔ اور بولی "خوب۔ تو آپ
ڈی۔ ایچ لارنس پڑھتے ہیں!" میں نے کہا۔ "جی ہاں"
—— بولی "خوب لکھتا ہے" —— میں نے کہا۔

"جی ہاں" ——— بولی "شاعر بھی تھا؟" ———
میں نے کہا "جی ہاں" ——— بولی "زندہ ہے؟" ———
میں نے کہا "جی ہاں" ——— وہ زور سے ہنسنے لگی
اور بولی "نہیں نہیں جی۔ مرگیا ہے بے چارا" میں نے کہا۔
"جی ہاں" ——— بے تحاشا ہنسنے لگی۔ اُس کے حلق کا کوا
پھڑکنے لگا۔ اور آنکھوں میں مرگھٹ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں
کی سی آسیبی چمک آ گئی۔ بڑی مشکل سے بولی "آپ تو جی ہاں
جی ہاں کے سوا ——— ؟" اور وہ ایک دم رُک گئی۔
گھوم کر ایک طرف ہو گئی۔ میں بھی گھوم کر ایک طرف ہو گیا۔
لمحہ بھر کے بعد الماری سے کتابیں نکالیں۔ بستر لپیٹا۔ نیچے
مالک مکان کو ——— جو سنیاری کی دُکان کرتا تھا ———
کرایہ دیا۔ اور ایک ہوٹل میں جا رُکا! کائنات نے ایسی
اُلٹی زقند بھری، کہ مجھے ہر چیز پرانی نظر آنے لگی۔ جوانی اور
تازگی سے عاری ——— فرسودہ اور بیہودہ!

میری بدحواسی حق بجانب تھی!

اپنے تصورات میں جو ہیولیٰ میں نے تخلیق کر رکھا تھا
اُس کے رنگ و روغن میں پھیکا پن سا پیدا ہو چلا۔ کالج کی تعلیم
میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی تھی، اس لئے جنسیات کے
متعلق کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ لیکن جو جنسی تعلق انسانی
دماغ کے ایجاد کردہ اصولوں میں گھر کر رہ جائے۔ وہ ایک
مصنوعی چیز بن جاتا ہے۔ اس میں وہ بے ساختگی نہیں رہتی
جو محبت کی جان ہے" اور جو حقیقت میں میرے تصورات
اور احساسات کی بنیاد تھی۔

غیر محسوس طور پر مجھ پر اُن کتابوں نے اثر ضرور کیا
کیونکہ میں خلافِ معمول بن ٹھن کر رہنے لگے۔ اسی ہوٹل
میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی۔ تین کمرے کرائے پر لیئے، چیف
ایکٹرس کا کمرہ میرے کمرے سے ملحق تھا، میں ایک روز
برآمدے میں بیٹھا فرائیڈ کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا، کہ
محترمہ اپنے کمرے سے نکلیں۔ اگرچہ انھوں نے لباس
پہن رکھا تھا۔ لیکن وہ لباس نہ ہونے کے برابر تھا۔ گورے
گورے جسم کے چمکیلے خطوط بالکل واضح اور صاف تھے،
میں گھبرا کر کتاب کو گھورنے لگا۔ تو ——— نمیشر بیٹھا
——— خدا کی قسم۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی۔ ایک
عجیب و غریب خوشبو سے میرا دماغ لبریز ہو گیا۔

بولی "آپ یہاں ——— ؟"

میں نے فوراً کہا "میں یہاں ایک کالج میں پڑھتا
ہوں" اب میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے
انداز اس درجہ بے باکانہ تھے۔ کہ میں دیکھتے رہنے پر مجبور
ہو گیا۔ کیسی آنکھیں جو ایک دھکا سا لگاتی ہیں نا ———
وہ قوت چیف ایکٹرس کی آنکھوں میں موجود نہ تھی۔ اُن
میں جاذبیت تھی" کھلی دعوت تھی، آسودگی تھی"۔

وہ بولی "پر آپ ہوٹل میں کیسے ٹھہرے؟"

میں نے کہا "طبیعت ہی کچھ اس قسم کی ہے،
کالج میں بدمذاقوں کا زور ہے" اور میں بدمذاقوں سے
بقدر بھاگتا ہوں"

قریب کے کمروں میں ایکٹر ریہرسل کر رہے تھے۔
ایک ایکٹر کی آواز آئی "میں گوش بر آواز ہوں۔ تیرے
لبوں سے اظہارِ محبت سننے کے لئے سراپا نیاز ہوں۔ اے
پری۔ تو نے اپنی آنکھوں پر بانہہ کیوں دھری۔ تو رو رہی
ہے؟ آنسوؤں کے موتی کھو رہی ہے؟ اس کا مطلب
ہے کہ میری تقدیر سو رہی ہے! ؎

افسوس تو نے عشق کو ناکام کر دیا
اور جذبۂ نیاز کو بدنام کر دیا
جو راز میری روح میں پنہاں تھا اے فروغ
اشکوں نے تیرے اسکو طشت از بام کر دیا

"آخری مصرع میں سکتہ پڑتا ہے!" ایکٹرس
بولی! ۔

اور میں نے مسکرا کر کہا "آپ خوش مذاق معلوم
ہوتی ہیں!"

"شکریہ" اس نے میرے کندھوں پر اپنے دونوں

ہاتھ ٹیک کر مسکراہٹوں کی ایک پھلجھڑی چھوڑ دی۔ اور میرے تصور کا ہیولیٰ کائنات کی بے کراں پہنائیوں میں رقص کرنے لگا۔!

تو نصیر میاں۔ کمپنی کے ڈائرکٹر کی موجودگی کے علی الرغم چمپا بائی میری طرف جھک گئی، شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ہمراہ انگریزی ہوٹلوں اور سینماؤں کی مصروفیتوں نے اُسے اپنا پارٹ یاد کرنے کی مہلت نہ دی۔ ڈرامہ دو دن پر ملتوی ہوگیا۔ اور جس روز ڈرامہ اسٹیج کیا جانا تھا تو چمپا بائی نے مجھے گود میں اُٹھا کر کہا۔

"جانتے ہو نواب ——— صاحب نے یہ ڈرامہ دیکھنے کے بعد مجھے کیا چیز انعام دی تھی؟

یہ گھڑی! یہ سونے کی ہے۔ اس میں ہیرے جڑے ہیں۔ آجکل اِس کی قیمت اڑھائی ہزار ہے، اور پھر کیسی خوبصورت ہے، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کلائی پر چنبیلی کا پھول باندھ رکھا ہے۔ تم بھی باندھ دیکھو نا ——— اہا ہا۔ تمہاری گوری کلائی پر یہ گھڑی کیسی پیاری لگتی ہے ——— اکبر صاحب۔ تم اتنے دنوں تک میری زندگی میں کیوں نہ آئے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرا تمہارا سمبندھ اُس وقت سے ہے، جب آسمانوں کے بنانے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔

اکبر صاحب! ———" ——— اور اُس نے میرا سر چوم لیا! ——— سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"دیکھوں آج مجھے تم کیا تحفہ دیتے ہو۔ وہ نواب تو میرے حسن سے پل بھر کے لئے متاثر ہوا تھا۔ اور تم تو پوری رات کہہ رہے تھے کہ میرے بغیر تمہاری زندگی دھنی ہوئی تیرن کررہ جائے گی ——— اب دیکھوں تم کیا لاتے ہو میرے لئے!"

یعنی اِس تمام چوماچاٹی کا محور یہ تحفہ تھا، میں نے بڑی مشکل سے اپنی باچھوں کو کھینچ کر مسکرانے کی کوشش کی ——— لیکن باچھیں توڑتے وقت بھی کھچ جاتی ہیں میری یہ مسکراہٹ گریہ و تبسم کے بین بین کی کوئی حالت تھی جسے دیکھکر چمپا بائی گھبرائیں ضرور۔ مگر پھر اپنے حواس مجتمع کرکے بولیں "میں منتظر رہوں گی!"

میں تو نرگس کے پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کرنے کی دُھن میں تھا۔ اور پھر ان پھولوں کی گرانی کا بھی شاکی تھا۔ یہاں اڑھائی ہزار کی گھڑی کو میرے متوقع تحفے کا دیباچہ بنا کر دکھایا گیا تھا۔ جب محترمہ تھیٹر ہال کو گئیں۔ تو میں نے ہوٹل والوں سے حساب چکایا۔ اور پھر ہوسٹل میں آبراجا۔ دوسرے روز تھیٹر دیکھنے گیا تو چمپا بائی سیاہ لباس پہنے اسٹیج پر آئی۔ ایک غزل گائی جو میں اس سے چار مرتبہ سن چکا تھا۔ غزل گا کر اس نے باکس میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سیٹھ کی طرف اشارہ کیا اور اسٹیج سے غائب ہوگئے۔ سیٹھ جی قبل از وقت بڑھی ہوئی توند پر ہاتھ پھیرتے اُٹھے اور باہر نکل گئے۔ میں اپنا سر کھجاتا سیدھا ہوسٹل میں آگیا!۔

نصیر بیٹا۔ یہی تجربات ہیں جنھوں نے مجھے بے باک بھی کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ میں نے خود محسوس کیا کہ میرے چہرے پر ایک خاص قسم کی سنجیدگی عود کر آئی ہے میرے ماتھے کی لکیریں گہری ہوگئیں جو میرے تفکر اور سوچ بچار کی غمازی کر رہی تھیں۔ امتحان دے کر اور پھر اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مار کر میں کامیاب ہوگیا۔ اور جب شہر میں تحصیلدار بھرتی ہوا۔ تو اپنے تشنہ تصور کی پیاس بجھانے کے لئے میں نے عجیب عجیب پینترے بدلے، محبت کرنی چاہی تو ہوس نے قابو پالیا۔ ہوس کے جذبے سے کھیلنا چاہا تو محبت ہونے لگی۔ اور پھر انہیں دنوں ایک لڑکی نے ——— ایک دہقان لڑکی نے ——— میرے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے اختیارات استعمال کرکے اس کے والد کو نقصان پہنچایا۔ پھر وہ نہ جھکی میں نے منتیں بھی کیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اور

آخر میں نے اُسے زبردستی اُٹھوالیا۔

شام کا وقت تھا۔ وہ گھاس کا گٹھا اُٹھائے گھر جا رہی تھی کہ میرے کارندے اُس پر جھپٹے، اور میرے بنگلے میں اُٹھا لائے، ابھی ہاتھا پائی ہی ہو رہی تھی کہ دھڑام دھڑام کرکے دروازے بجنے لگے۔ دہقان مجھے گھسیٹ کر تھانے لے گئے، کیس چلا اور میں برطرف کر دیا گیا۔ یہ وہی کیس تھا جس کے متعلق میں نے تمہیں صرف یہی لکھا تھا کہ رشوت ستانی کا جھوٹا مقدمہ ہے، جو انشاء اللہ بخیر و خوبی انجام پائے گا۔

یوں منہ کی کھا کر اور سرکاری ملازمت سے ٹھکرائے جانے پر میں سوشلسٹ ہو گیا! جہاں جاتا ماحول و وراثت کا قصہ لے بیٹھتا۔ ہندوستان کے ننانوے فی صدی نوجوانوں کی طرح میں بھی سوشلزم کی حقیقی روح سے بے بہرہ محض تھا۔ مگر جو کچھ ہوائی لیڈروں سے ہنگامی جلسوں میں سن چکا تھا۔ اس کی تاویلیں اور تفسیریں کرتا پھرتا۔ ایک اخبار میں خبروں کے ترجمے کرتا رہا۔ صحافتی ماحول میں میرے سوشلزم نے جلا پائی۔ اور میں نے عملی اقدام کا تہیہ کر لیا۔ اور ایک جلسے میں ایک ایسی تقریر کر بیٹھا جو سوشلزم کے اُصولوں کے خلاف اور میرے جوشیلے اور شکست خوردہ احساسات کا عکس تھی۔

اور جب مجھے ہتھکڑی پہنائی گئی۔ اور قومی نعروں کے درمیان میں پولیس کی سلیٹی لاری میں سوار ہوا۔ تو میں نے اچانک تلک۔ محمد علی۔ گاندھی اور جناح کو اُفق دُھندلکوں میں ہٹتے اور سمٹتے دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُنھوں نے میری تقریر سے متاثر ہو کر میرے لئے جگہ خالی کر دی ہے۔

اور جب مجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ تو اچانک میرے یقینوں نے کروٹ بدل لی۔ اور مجھے ایک نئی دنیا نظر آئی۔ جیسے ایک خوبصورت پتھر کو اُلٹا جائے تو نیچے سے رینگتے ہوئے گھناؤنے کیڑوں کا ہجوم اُبھر آئے! ——— سوشلزم کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور جب میں جیل سے نکلا تو بالکل سیدھا سادا اکبر تھا۔ اپنے پُرانے کپڑے پہنے جب میں نے جیل کے بڑے گیٹ سے باہر قدم دھرا تو نعرے بلند ہوئے "انقلاب زندہ باد!" "اکبر علی زندہ باد!" ——— شاید میں ان نعروں کے حریری پردوں سے دھوکا کھا کر ادھر جھک جاتا۔ لیکن جیل کی زندگی کا اثر ایسا معمولی نہ تھا۔ کہ طوفان کے ایک ہی ریلے میں بہ نکلتا میں پھولوں سے لدے ہوئے ایک تانگے پر سوار ہو کر شہر کے بڑے چوک تک گیا۔ اور جب وہاں سے فراغت ہوئی تو جانتے ہو کہاں جا نکلا؟

نصیر بیٹا۔ یہ خط میں تمہیں اسی مقام سے لکھ رہا ہوں جس نے مجھے باؤلی دُنیا سے پناہ دی، اور سکون و سرور کی حقیقی خوشی سے لذت یاب کیا۔ جیل سے نکلنے کے بعد کے واقعات مختصر مگر دلچسپ ہیں، اگر تم میرے لاابالیانہ انداز سے اکتا گئے ہو، تو خط کا یہ حصہ پڑھنے کی ہمت ضرور پیدا کرو، شاید تمہیں ان سطور میں میرے حال کے علاوہ میرا مستقبل بھی دھڑکتا نظر آ جائے۔

یہاں آنے سے قبل میں نے اپنے والدین سے ملاقات کی، جنھوں نے میری زندگی کے نشیب و فراز کو میری اولوالعزمی پر محمول کر رکھا تھا۔ دراصل اولاد کے حق میں ماں باپ کی قلبی آنکھیں دھندلائی رہتی ہیں۔ میں نے انہیں حقائق سے صرف اس لئے آگاہ نہ کیا۔ کہ اُن کی بے داغ محبت کے ایوان ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ جائیں گے، میں نے انہیں وطن کی محبت اور قوم کی آن پر جان و مال کی قربانی کے متعلق ایسی باتیں سنائیں جنھوں نے اُن کی پتلیوں پر آبی پردے سے پھیلا دیے وہ مجھے یوں دیکھنے لگے، جیسے میں اُن کا نام ابدالآباد تک تاریخ عالم میں زندہ و درخشندہ کرنے والا ہوں، اور نصیر بیٹا۔ میں جذبات کی رَوؤں میں بہتے ہوئے نکیلی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر پہلے سا جذبہ باقی نہیں رہا۔ لیکن یہاں میرا شعور میرا ساتھ چھوڑنے جا رہا ہے ———

میں تمہیں کس طرح لکھوں کہ اُس شام کو میرے اُن والدین نے روکھی سوکھی روٹی کھائی، جن کی پونجی کو میں اپنی زندگی کی ریس میں لٹا بیٹھا تھا۔ اُنھوں نے پوری کوشش کی، کہ مجھ سے اُن کی ناداری اور بے قراری چھپی رہے، لیکن میں نے اُن کے لباس پر ٹانکی ہوئی دھجیوں۔ اور اُن کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی خلاؤں کو دیکھ لیا تھا۔ صبح صبح ہی میں نے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے رختِ سفر —— یعنی دری۔ تکیہ اور کمبل باندھا۔ اور یہاں آگیا۔

یہ ایک قصبہ ہے، اچھی خاصی رونق ہے۔ یہاں میں نے محکمۂ امدادِ باہمی کے افسر سے ملاقات کی۔ اُن کے دو نخصوں کو بیس روپے ماہانہ پر پڑھاتا رہا۔ ایک وقت کھانا کھاتا تھا۔ کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا۔ جسے میں بار بار دریا کے کنارے جا کر دھولاتا تھا۔ بیس میں سے بارہ، تیرہ روپے ہر ماہ بچنے لگے، چھ ماہ کے بعد یہاں سے رخصت لی، اور جڑانوالہ میں سگریٹ پان کی ایک دکان کھولی، وہاں سے کچھ رقم کما کر پھر یہاں آگیا ہوں، آنے کے ڈپو کا سارا انتظام میرے پاس ہے، ہر ماہ اپنے والدین کو پندرہ روپے بھیج دیتا ہوں، اور وہ مجھے ایسے محبت بھرے خط لکھتے ہیں، کہ کیا بتاؤں۔

پرسوں اُن کا ایک خط آیا ہے کہ اُنھوں نے ایک نہایت اچھے گھرانے میں میرے متعلق بات چیت کر لی ہے لڑکی بلا کی ذہین ہے، اُمورِ خانہ داری سے واقف ہے، سگھڑ ہے۔ سیانی ہے —— یہ سب باتیں ہیں لیکن نصیر —— مجھے ایک لفظ کی تلاش سارے خط میں رہی، مگر ناکامی ہوئی۔ آخر وہ حسین بھی ہے کہ نہیں؟ آخر وہ میرا معیار بھی پورا کرتی ہے یا جھری والی خاتون اور تھیٹر والی رقاصہ کا روپ دھارن کئے ہوئے ہے؟

لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے، اُس کے لمبے لمبے بال ہیں، جو اتنے سیاہ ہیں۔ کہ اُن میں سنہری رنگ جھلکنے لگتا ہے، اس کے ماتھے سے ایک نور نکلتی رہتی ہے اُس کی آنکھوں کے عمق میں ہستیوں کے خزانے ہیں، اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر بلبل دھوکا کھا جاتی ہے۔ یعنی اس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو خواجہ حافظ کے "ترک شیراز" میں تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری خیالی جنت شرمندۂ معنی ہونے والی ہے:

سب سے بڑی آرزو تو یہی ہے کہ میری منگیتر اس زمانے کی کلوپیٹرا ہو، اور اس کے بعد یہ تمنا ہے کہ رقم اکٹھی کروں، اور سرمایہ دار۔ نہیں تو کم از کم ایڈیٹر کہلاؤں، ایک فلیٹ ہو، دو چار نوکر چاکر ہوں، کتابوں کا ایک انبار ہو، دوست ہوں، آرام سے زندہ رہوں، اور مزے سے مر جاؤں، سیاسیات کے جھگڑے اور عشق و محبت کے ہنگامے بے کار لوگوں کے لئے ہیں، ایک پڑھے لکھے ہندوستانی کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے وطن کی پیٹھ کا بوجھ نہ بنائے، چپ چاپ جیئے اور چپ مر جائے!

لیکن اس چپ چاپ جینے کے لئے رفیقۂ زندگی کا میرے تصورات کی صحیح تصویر ہونا ضروری ہے، عنقریب الماری میں جھری پیدا ہونے والی ہے، اور میری زندگی جھری کی پرلی طرف کے نظارے کی دُھن میں کروٹوں پر کروٹیں لے رہی ہے، اگر میرے تصورات کو دھکا نہ لگا تو میں تمہیں اپنے موجودہ پتے سے بہت جلد آگاہ کر دوں گا اور اگر میں نے یہاں بھی منہ کی کھائی تو —— تو میں ہنوز کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔

تم اگر مجھے خط لکھنا چاہو تو میرے گھر کے پتے پر ہی لکھو، اور دُعا کرو کہ میری خیالی محبوبہ میری منگیتر کے پیکر میں حلول کر جائے۔

آج کل میرا مشغلہ عینک چڑھا کر تارے گننا ہے، میری نظر کمزور ہو گئی ہے، اس لئے میں عینک کے بغیر تارے نہیں گن سکتا!

تم نے اپنے چھوٹے بچے کا کیا نام تجویز کیا ہے؟

—— تمہارا۔ اکبر علی

ادیبؔ مالیگانوی

جلوۂ منتظر

تجلّیِ قلب و نظر بن کے آؤ ۔۔۔ مری شامِ غم میں سحر بن کے آؤ

جسے آج تک بام و در رو رہے ہیں ۔۔۔ وہی رونقِ بام و در بن کے آؤ

ضرورت ہے پھر خاکِ دل کو تمہاری ۔۔۔ تم آؤ، تو برق و شرر بن کے آؤ

تمہیں جن دعاؤں سے رخصت کیا تھا ۔۔۔ مجسّم انہیں کا اثر بن کے آؤ

نشیمن کی قیدیں کہاں اور کہاں ہیں ۔۔۔ مری جرأتِ بال و پر بن کے آؤ

تصور سے جی اپنا بہلاؤں کب تک ۔۔۔ تمہیں خود بہشتِ نظر بن کے آؤ

مرے دن اندھیرے، مری رات کالی ۔۔۔ چلو شمس بن کر، قمر بن کے آؤ

تماشائے پیہم، جو ممکن نہیں ہے ۔۔۔ تو اک جلوۂ مختصر بن کے آؤ

قسم اعتبارِ محبت کی تم کو ۔۔۔ ہر انجام سے بےخبر بن کے آؤ

ہجومِ غم و یاس کی ظلمتوں میں ۔۔۔ چراغِ سرِ رہگذر بن کے آؤ

گئے تھے مجھے "سرد و ویران" کر کے ۔۔۔ محبت کا رنگیں اثر بن کے آؤ

مری زندگی تم، مری شاعری تم ۔۔۔ سرورِ حیات و ہنر بن کے آؤ

کہاں تک پیاموں سے تسکینِ خاطر
خود اک وعدۂ معتبر بن کے آؤ

پاگل "گلی"

"ترقی پسند ادب کا کامل نمونہ" پیام ادب میں
اسکی اشاعت سے مقصود صرف یہ ہے کہ ناظرین کرام اسے
ملاحظہ فرما کر شاعر کے تخلص کی صداقت کے قائل ہو جائیں

شہر کے قلب میں سڑکوں کی حسین شریانیں
جن میں دولت کے نشے !!
بنک کی ایک عمارت کا جلال
یعنی مفلس کے دھڑکتے ہوئے سینے کا بخار
اس کے پہلو میں گلی
جس میں بدبو کے دہکتے ہوئے شعلوں کی ہنسی

(۲)

ہڑیاں، جھونپڑیاں، ٹھٹھری ہوئی، سہمی ہوئی
جابجا گوبر و خاشاک کے تاریک مزار
چیل کووں کے محل
مچھروں، پسوؤں، امراض کے پوشیدہ وطن

(۳)

لاشیں بیلوں کی سڑی اور گلی
انتڑیاں ابھرے ہوئے پیٹ میں سے نکلی ہوئی بکھری ہوئی
جن کو کھاتے ہیں سور
اور جہاندیدہ گدھ

(۴)

اک لنگڑاتے ہوئے کوڑھی کی وہ بھوکی نظریں
جن میں سنسان مسافوں کی تڑپتی ہوئی روح
یہ ہیں تہذیب و تمدن کے وہ گہرے ناسور
جن کو دنیا سے مٹانا ہے مجھے !!!
انقلاب آئیگا اک روز ضرور آئیگا
غور سے دیکھتا رہ تیرگیٔ مستقبل !!

عزیز احمد بی اے

واردات

رازِ الفت کا دل کو ہوش سہی
آنکھ کہتی ہے لبِ خموش سہی

آکہ روشن ہو کائنات مری
شب کی دنیا سیاہ پوش سہی

میری ہستی سے کھیلنے والے
یہ بھی احسان بارِ دوش سہی

میرے دل پر تو گر پڑی بجلی
مسکراہٹ وہ گل فروش سہی

درد کا نام ہے سکونِ حیات
دوستی تیری غم فروش سہی

تشنہ کامی کا ہوں شکار ابتک
ہر ادا تیری خم بدوش سہی

تم کو میرا نہ کچھ خیال ہوا
ہر وفا میری سرفروش سہی

بھول جاؤ عزیز کو اپنے
آرزوؤں کا دل میں جوش سہی

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

غلطی

اس شام کو بھی عجب تماشہ ہوا جب میں کھیل کود کر تھکا ہارا واپس آیا تو غلطی سے ریڈیو کے پاس جا بیٹھا؛ پروگرام پڑھا تو جی اچھل اٹھا۔ ایک اسٹیشن سے ایک بوڑھے تجربہ کار شکاری اپنی زندگی کے حالات سنا رہے تھے، دوسرے سٹیشن سے ایک فلمی ہیرو صاحب مدظلہ اپنی رومان انگیز زندگی پر روشنی ڈال رہے ہیں اور تیسرے سٹیشن سے ایک ماہر طفلیات بزرگ بچوں کی نفسیات اور تعلیم و تربیت پر تقریر کر رہے تھے۔

تینوں پروگرام ایک ہی وقت شروع ہوتے تھے شاید پانچ بجے یا چھ بجے۔ اب دل میں رسّہ کشی شروع ہوگئی، پھر سوچا کہ بچوں سے ہمیں کیا واسطہ؟ وہ اپنی نفسیات اپنے پاس ہی رکھیں، اور ہماری اپنی نفسیات سنبھالی نہیں سنبھلتیں اور پھر ان کی تعلیم و تربیت ——— چلو اس پروگرام کو چھوڑو۔ اب رہی وہ ایکٹر صاحب کی داستان حسن و عشق، اسے سن کر ہمیں خواہ مخواہ رشک آنے گا۔ بہتر یہی ہے کہ شکاری صاحب کی باتیں سنی جائیں بندوق تو ہمیں بھی چلانی آتی ہے ایک مرتبہ ایک بھینس پر فائر کرتے وقت ہم نے ایک کتّے کو مار دیا تھا، اور وہ کتا بھینس سے کوئی دس پندرہ فٹ مشرق کی جانب تھا۔ اب آپ ضرور پوچھیں گے کہ بھینس پر کیوں فائر کیا گیا۔ سو عرض ہے کہ اگر کوئی چیز آپ کے فوٹو اور آپ کی بنائی ہوئی تصویریں نوش کر جائے تو آپ اسے کیا سزا دیں گے چنانچہ ہم نے بھینس سے دس فٹ ادھر کھڑے ہو کر فائر کیا۔ بھینس بال بال بچی اور کتا مر گیا۔

خیر صاحب! میں نے شکاری صاحب کی تقریر سننے کا فیصلہ کر لیا اور ریڈیو سے الجھ پڑا۔ نہ جانے کیا مصیبت تھی وہ سٹیشن ہی نہ ملتا تھا۔ عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں قوالیاں ہو رہی ہیں، کتے بھونک رہے ہیں۔ سیٹیاں بج رہی ہیں، بادل گرج رہے ہیں لیکن وہ سٹیشن نہیں لگتا۔ کچھ ایسا موسم بھی خراب نہیں تھا۔ سوچا شاید ریڈیو بگڑ گیا ہے، لیکن اور پروگرام تو سب کے سب سنائی دے رہے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ سٹیشن مجھے مل گیا، شکاری صاحب تقریر شروع کر چکے تھے آواز آئی۔

"ہاتھی کا شکار بہت مشکل ہے، کیونکہ ہاتھی سپورٹسمین بالکل نہیں ہوتا۔ ہاتھی ایک کینہ پرور، کینہ خو، کینہ جو اور کینہ نواز اور کچھ کینہ سا جانور ہے۔ اگر کوئی ہاتھی سن رہا ہو تو میں معافی چاہتا ہوں لیکن یہ بات سچ ہے۔ اگر ہاتھی ایسا نا معقول نہ ہوتا تو شکاریوں سے اتنی سی بات پر لڑنا جھگڑنا کیوں دیکھئے نا شکاری فقط اسے مارنا ہی چاہتے ہیں نا اور تو کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ اور اتنی سی بات کے لئے اتنا بغض رکھنا، بدلے لینا، یہ کرنا وہ کرنا، یہ سب باتیں ہاتھی کو انسانیت سے نیچے گرا دیتی ہیں۔ اور جانوروں کو دیکھئے۔ شکاریوں سے کتنی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ دسمبر سن بیس کا ذکر ہے، پندرہ تاریخ تھی، اور یہی رات کے کوئی گیارہ بجے تھے، میں جنگل میں بیٹھا ایک ہاتھی کا انتظار کر رہا تھا۔ کمبخت نے بڑا پریشان کیا، آخر رات کے دو بجے کہیں ہاتھی آیا، اکیلا نہیں

ایک اور ہاتھی کو بھی ساتھ لے آیا، میں نے گولی چلائی، میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ گولی فقط ایک ہاتھی کو لگی، دونوں ہاتھیوں کو نہیں لگی۔ ایک ہاتھی تو وہیں بیٹھ گیا، دوسرا میری طرف لپکا۔ اگلے روز مجھے پتہ چلا کہ وہ ہتھنی تھی —— یعنی مسز ہاتھی۔

خیر! تو ہتھنی نے اپنے سونڈ سے درخت کی کئی ٹہنیاں توڑ دیں اور مجھے بھی نیچے کھینچ دیا۔ (غالباً میں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ میں ایک درخت پر بیٹھا تھا) میں گرتے ہی اُچھلا اور اُچھلتے ہی پھر گرا۔ پھر اُٹھا جلدی سے گرا اور اُٹھا، اور بھاگا۔ ہتھنی نے تعاقب کیا، کوئی پندرہ میل تک میں بھاگتا رہا۔ پھر لیے پندرہ نہیں ہی کوئی دو تین میل بھاگا ہوں گا۔ اتنے میں مجھے موقع مل گیا اور ہتھنی کو چکر دے کر میں ایک درخت پر چڑھ گیا، ہتھنی نے منٹوں میں اس درخت کو بھی گرا لیا میرے حواس بھی باختہ تھے اور میں بھی تقریباً باختہ ہی تھا، اگر باختہ نہیں تو فاختہ ضرور تھا۔ میں زندگی سے بالکل ناامید ہو چکا تھا۔ میں آخری حملے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے ہتھنی کے سامنے کھڑے ہو کر نشانہ باندھا اور گھوڑا دبا دیا (بندوق کا گھوڑا، میں گھوڑے پر سوار نہیں تھا۔ زمین پر کھڑا تھا۔) گھوڑا تو دبا دیا لیکن بندوق سے کچھ بھی نہیں اندر کوئی کارتوس ہوتا تو کچھ نکلتا بھی۔ اب ہتھنی آگے بڑھی لپکی۔ بھاگی۔ سونڈ اٹھا کر وہ چنگھاڑتی ہوئی مجھ پر حملہ آور ہوئی، میرے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔ لیکن پھر میں نے سمجھا کیا۔ میں نے ہمت کر کے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں سے لگا کر کہا کہ اگر تمہیں میری زندگی سے نکال دیا جائے تو تیری زندگی بالکل ویران رہ جائے گی، صحرائے اعظم کی طرح یا صحرائے "لاہاری" کی طرح، یا سائبیریا کے میدانوں کی طرح —— بالکل اُجاڑ رہ جائے گی۔ تمہارے دم سے میری ظلمتیں منور ہیں، تمہاری ہی یہ سب چہل پہل ہے، وہ کچھ مسکرائی اور میں غش کھاتے کھاتے بچا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری جگہ میرے دوست شیخ قطب الدین ہوتے تو ضرور غش کھا جاتے، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ چاروں طرف خموشی تھی فقط ایک اُلّو تھا جو اپنی پیاری اور سُریلی آواز سے اس خاموشی کو توڑ رہا تھا۔ ہمارے سَر پر تاروں کی چھت تھی اور پاؤں کے نیچے زمین تھی، ہمارے سامنے مشرق تھا، پیٹھ پیچھے مغرب، دہنے بازو جنوب تھا اور بائیں ہاتھ شمال۔ ایسی رومان انگیز، رومان خیز، اور رومان پرور فضا میں میں نے اظہارِ محبت کیا۔ اور اُس نے مسکرا کر گردن جھکا لی اور میں تقریباً بے ہوش ہو گیا، میں نے دل میں سوچا کہ میرا دل دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کسی ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہیئے۔ میرے خیال میں کل میں حکیم علی رضا سے ضرور ملوں گا۔ جب دل کی دھڑکن ذرا ٹھیک ہوئی تو میں نے اُس کا ہاتھ پھر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ (غالباً میں نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا) میں نے دیکھا کہ اس کی پیاری پیاری اُنگلیوں میں سے ایک اُنگل کا پیارا پیارا ناخن بہت بڑھا ہوا تھا ہو گا کوئی آدھ یا ایک اِنچ۔ میرا جی چاہا اُس ناخن کو چوم لوں یک لخت دل نے کہا ہمت کرو اور آج ہی زندگی بھر کے لئے پیمانِ وفا باندھ لو، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں نے ہمت کی، اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا —— کیا تم میری ایک اِلتجا مانو گی؟ اُس نے اِثبات کے طور پر سر ہلا دیا۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور چلّا کر بولا —— "دیکھو میں آخری مرتبہ تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اسکول نہیں گئیں تو یقیناً پٹ جاؤ گی، ایسی ضدی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی، آنے دو تمہاری اُمّی کو دیکھو تمہاری کیسی گت بنواتا ہوں۔"

اُدھر اُس نے مچلنا شروع کر دیا۔ پہلے تو صرف مچلتی رہی پھر ٹھنکنا اور باقاعدہ رونا شروع کر دیا، بہتیرا منایا، پیار کیا، چاکلیٹ اور ٹافی کے وعدے کئے، سینما کا لالچ دیا۔ بہتیری منت سماجت کی لیکن اُس کے کان پر

جُوں تک نہ رینگی۔ یہ بچے بھی عجیب ہوتے ہیں، اُن سے ذرا شرافت سے پیش آؤ تو اکڑ جاتے ہیں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ اُن میں رُشک کا مادّہ بہت ہوتا ہے، چنانچہ میں نے پڑوس کے ایک بچّے کی تعریفیں شروع کر دیں۔

میں نے کہا ذرا ستّو کو تو دیکھو کتنا پیارا بچّہ ہے، کبھی آج تک ضد نہیں کی، نہ کبھی تمہاری طرح روتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُسے پیٹ بھی دو تب بھی نہیں روتا۔ اَب میں اس کے لئے پندرہ روپے کی گلاب جامن اور بیس روپے کے کیلے لے جاؤں گا۔ تم سے وہ لاکھ درجے اچھا ہے، اُسکی عادتیں نہیں دیکھیں تم نے، کتنی اچھی اور سُدھری ہوئی ہیں، اس کی ہر ایک بات سے یہ صاف عیاں ہے کہ وہ سب سے مختلف ہے۔ وہ ہمیشہ علی الصبح اُٹھتا ہے، ابھی اندھیرا ہی ہوتا ہے کہ وہ پانی پینے جاتا ہے، پانی پی کر زور سے ڈکراتا ہے اور سارا جنگل گونجنے لگتا ہے، چرند، پرند، درند، سب جاگ اُٹھتے ہیں۔

اس کے بعد شیر چھوٹا حاضری کھاتا ہے اور فوراً ہی شکار کھیلنے نکل جاتا ہے۔ وہ درمیانے جانوروں کا شکار کرتا ہے۔ نہ بہت چھوٹے جانوروں کو کچھ کہتا ہے اور نہ بہت بڑوں کو مثلاً گلہری یا چڑیا کو شیر کبھی نہیں چھیڑتا اور نہ ہی کبھی شتر مرغ کو ستاتا ہے۔ ناشتے کے بعد شیر جنگل میں سیر کرنے نکل جاتا ہے، اپنے اہلکاروں سے مل کر تبادلۂ خیالات کرتا ہے، اُس کے اہلکار لومڑی، چیتا، اور ریچھ وغیرہ ہیں، جو بعض اوقات اس کے لئے شکار بھی تحفتہً لے آتے ہیں۔ دوپہر کو بیوی بچّوں کے ساتھ کھانا کھاتا ہے، اِس کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتا ہے۔ شام کو شیر کھیل کھیلتا ہے۔ یا کسی دوسرے جنگل کے شیر کے ہاں ملنے چلا جاتا ہے بعض اُوقات اور جنگلوں کے شیر اپنے کنبوں کو لے کر اُس کے ہاں آجاتے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد شیر کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں جنگل کا ہر جانور شرکت کرتا ہے، اُس وقت شیر اگلی صبح کے شکار کے لئے چند اچھے جانور منتخب کر لیتا ہے۔ پھر رات کو سونے سے پہلے شیر ایک مرتبہ پانی پینے ضرور جاتا ہے۔ دراصل شیر کو پیاس بہت لگتی ہے۔

شیر کو شکار کرنے کا بہترین وقت وہ ہے جب وہ پانی پینے جا رہا ہو، جب وہ پانی پینے کا ارادہ رکھتا ہو اور یہ ظاہر کر دے کہ اُسے پیاس لگی ہے تو یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ اُسے دودھ پلایا جائے، اسے حتیٰ الوسع پانی نہ دیا جائے کیونکہ اِس طرح اُس کے معدے پر بُرا اثر پڑے گا۔ دودھ میں شکر کم ہونی چاہیئے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ بغیر شکر کا دودھ سب سے اچھا ہے، اگر پھیکا دودھ نہیں مل سکتا تو کڑوا دودھ بلا مضائقہ پلایا جا سکتا ہے۔

کئی لوگ بچّوں کو یخنی پلاتے ہیں، میں اس کے سخت خلاف ہوں، میں نے آج تک کسی بچے کو کوئی ثقیل چیز نہیں پلائی۔

ایک بات اور یہ ہے، وہ یہ کہ دودھ پیتے وقت بچّے کا دھیان کسی اور طرف ہونا چاہیئے، مثلاً ریڈیو بج رہا ہو، ریڈیو پر کوئی تقریر ہو رہی ہو یا پکّا راگ ہو رہا ہو (بچے پکّے راگوں کو بے حد پسند کرتے ہیں اور تقریریں سُن کر وہ بہت محظوظ ہوتے ہیں)۔ قصّہ مختصر کسی قسم کی موسیقی ہو، ویسے موسیقی بہت ضروری ہے، کیونکہ رومان اور موسیقی کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے، خاص طور پر اظہارِ محبت کے وقت تو اگر خوش قسمتی سے آس پاس کوئی گا رہا ہو یا ستار بجا رہا ہو تو بہت اچھا اثر پڑتا ہے، اگر کوئی بالکل نزدیک کھڑا ڈھول بجا رہا ہو تو ہماری خوش نصیبی ہے، موسیقی کی سفارش سے اکثر دیکھا ہے کہ اِلتجائے محبت قبول ہو جاتی ہے، مجھے وہ رات نہیں بھولتی جب میں نے ایک سنگدل کے قدموں پر اپنا دل رکھ دیا تھا، اور اس دل کو اپنے دل میں جگہ دینے کی بجائے اُس سنگدل کے دل نے میرے دل کو اپنے دل سے دُور پھینکنا چاہا، اِس دلدوز حادثے سے قریب تھا کہ میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے لیکن میرا دل

کوئی ایسا ویسا دل نہیں تھا، اور آخر اُس سنگدل کو رحمدل بننا پڑا۔ وہ رات کتنی پیاری تھی، کتنی دلفریب تھی، چاروں طرف سناٹا تھا صرف چند جھینگر گا رہے تھے ورنہ ہُو کا عالم تھا۔ میں بارگاہِ حُسن میں تھا۔ میں بالکل خاموش کھڑا تھا بالکل خاموش۔ اتنے میں ایک آہٹ ہوئی اور چند بندر بڑی تیزی سے میرے سامنے سے گزر گئے، دفعتاً میں نے ایک سایہ دیکھا جو میری طرف آ رہا تھا، یہ ایک ریچھ تھا۔ میں نے اپنی بندوق سنبھالی اور سانس روک کر بیٹھ گیا لیکن ریچھ نے عقلمندی اور دُور اندیشی سے کام لیا اور اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ اتنے میں ایک بھیڑیا میرے پاس آ کھڑا ہوا، جسے میں نے "ہشت" کہہ کر بھگانا چاہا، وہ نہ بھاگا، پھر اُسے دھمکایا ڈرایا لیکن وہ وہاں سے بالکل نہیں ہلا، اور سامنے کھڑا مجھے گھورتا رہا، آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے پانچوں انگلیوں کا وہ شاندار تھپڑ دیا جناب کے منہ پر کہ طبیعت صاف ہو گئی، تھپڑ کا لگنا تھا کہ اس نے بڑے زور سے رونا شروع کر دیا، رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں بہت گھبرایا کیونکہ اس کی چیخ پکار سے سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا، جب وہ بلک بلک کر رو رہا تھا تو مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہُوا کہ بچے کو مارنا نہیں چاہیئے، نرمی سے سمجھانا چاہیئے، محبت اور پیار سے۔ اگر اسے چمکار کے کوئی بات کہی جائے تو وہ فوراً مان جاتا ہے محبت سے تو ناممکن سے ناممکن کام ممکن ہو جاتے ہیں اور ممکن سے ممکن کام ناممکن ہو جاتے ہیں۔ اجنبی اپنے بن جاتے ہیں اور اپنے اجنبی بن جاتے ہیں۔ محبت تو سب سے بڑا جادُو ہے، لیکن ہمت کبھی نہیں ہارنی چاہیئے، اپنی قسمت سے کبھی بدگمان نہیں ہونا چاہیئے، بڑے اطمینان سے محبت کرنی چاہیئے، اگر خودداری کا مادہ موجود ہے تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ کامیابی آپ قدم چُومے گی۔ شعر عرض ہے:

تجھ کو زیبا ہے وفاداری تو ہرجائی نہ بن
دل کو آوارہ نہ رکھ ہر اک کا شیدائی نہ بن

خود تجھے چاہیں حسین پیدا کچھ ایسی شان کر
میں ترے قربان تماشہ بن تماشائی نہ بن

میں خود بارہا آزما چکا ہوں، خودداری ہی وہ چیز ہے جس کی محبت میں اشد ضرورت ہے، اور یہ بھی سو فیصدی سچ ہے کہ سچے دل سے کی ہوئی محبت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہوں، اگر واقعی آپ مذاق سمجھ رہے ہیں تو بڑا افسوس ہے۔ آپ یقین کیجئے، کیونکہ یہ بے حد سنجیدہ مسئلہ ہے، اس پر ایک معصوم کی زندگی کا دارومدار ہے، بھلا اگر خوراک اچھی نہ ملی تو تربیت کیا خاک ہو گی، آپ کا فرض ہے کہ بچے کی پوری پوری نگہداشت کریں، اُس کی خوراک کا خاص خیال رکھیں، نوکروں پر ہرگز اعتبار نہ کریں، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک نوکر پانچ مہینے کے بچے کو قیمہ اور پراٹھے کھلا رہا تھا اور بچہ مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ ایک دوسرے نوکر نے ایک دو ماہ کے بچے کو سالم مُرغ بھُون کر کھلا دیا۔ نوکر ہمیشہ بے احتیاطی کرتے ہیں، اور بچوں کا معاملہ بڑا نازک ہے، ذرا سی بے احتیاطی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا ہے، اور نہایت ہی بُرا اثر پڑتا ہے، نشانہ ٹھیک نہیں رہتا، زنگ لگ جاتا ہے شکل بگڑ جاتی ہے، حلیہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر، بے احتیاطی سے بندوق کا ستیاناس بلکہ اٹھیاناس ہو جاتا ہے اس لئے بندوق کو ہفتے کے ہفتے صاف کرنا چاہیئے، بہتر ہو گا کہ آپ یہ کام خود کریں۔ سب سے پہلے آپ بندوق کو بالکل خالی کر لیں کیونکہ بارہا ایسا ہوا کہ کارتوس اندر رہ گئے اور چل پڑے، ایسے کئی حادثے ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد بندوق پر خالص بندوق کے تیل کی مالش کریں، اور غور سے دیکھتے جائیں کہ کہیں چھوٹا موٹا سا سُوراخ تو نہیں ہے یا کہیں پر سے ٹوٹ پھوٹ تو نہیں گئی، کیونکہ اگر ذرا سا سُوراخ ہوا تو دودھ باہر نکل جائے گا اور بچہ بھوکا رہ جائے گا۔ ویسے دودھ پلانے کی یہ بوتل اپنا جواب آپ ہی ہے،

اُس کے بیشمار فوائد ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بچہ
جب چاہے دودھ پی سکتا ہے اور جب چاہے انکار کر سکتا ہے۔
بوتل کے ساتھ ایک پرچہ بھی ملتا ہے جس میں ہدایات ہیں۔
میں آپ کی سہولت کے لئے ہدایات پڑھے دیتا ہوں۔ سنئے
—— جب بچہ ایک مرتبہ پی چکے تو اسے گرم پانی میں ڈال
دیجئے۔ (بوتل کو) —— اور جب بچہ دو تین روز بوتل کو
استعمال کر چکے تو اُسے کھولتے ہوئے پانی میں اچھی طرح
اُبالا جائے اور تمام حصوں کو علیحدہ علیحدہ رکھ دیا جائے۔
(بوتل کو) — اور بچے کو دودھ پلاتے وقت اُس کے سر پر
ہاتھ پھیرنا چاہیئے (بچے کے سر پر) اور ہر روز استعمال سے
پہلے اسے دھوپ میں سکھا کر صاف کر لینا چاہیئے (بوتل کو)
بچے کو خوب بہلا پھسلا کر اور چمکار چمکار کر دودھ پلانا چاہیئے
اور یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اگر آپ نے بچے کو ایک مرتبہ
بھی دھمکا دیا تو اُس کے دل میں نہ صرف آپ کا ڈر بیٹھ جائے گا
بلکہ بوتل کا بھی۔ اور ممکن ہے کہ وہ ایک دن بڑا ہو کر آپ کو
ہی دھمکا دے۔

میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ بچے کو اپنے
پاس بٹھائیں، پہلے اُسے گدگدائیں، اُس کی ہتھیلیوں اور
اُس کے تلووں میں گدگدی کریں، جب وہ ہنسنے لگے تو اُسے
اور بھی گدگدائیں اور پھر اُسے خوب پیار کریں —— اس
کے بعد اُس کی گود میں سر رکھ کر اپنے دل کے راز کہہ دیں،
سب کچھ بتا دیں، یہ شعر ضرور پڑھیں ؎

یوں زندگی گزار رہا ہوں تیرے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اور پھر بڑے موثر بلکہ مسجع اور مقفیٰ لہجے میں کہیں
کہ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں یا تو خودکشی کر لوں گا
یا اپنے آپ کو مار ڈالوں، یہ سب تمہاری محبت کا قصور ہے،
میرا قصور ہرگز نہیں، میری آنکھوں کا قصور ہے ——
(یہاں آپ ضبط سے کام لیں اگر آپ نے وہ شعر ؎

آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

پڑھ دیا تو سارا کیا کرایا مٹی میں مل جائے گا) میری آنکھوں کا
قصور ہے، میرے دل کا قصور ہے، میرے جگر کا قصور ہے
اور میرے دماغ کا قصور ہے، بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے؟
محبت میں کبھی کسی کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اسی طرح خوب ڈھنگی
دے کر جواب کا انتظار کریں ممکن ہے کہ جواب میں دیر
ہو جائے لیکن جواب ملے گا ضرور۔ جواب ہمیشہ ملتا ہے
مختلف جانور مختلف طریقوں سے جواب دیتے ہیں۔ ریچھ
چھیڑ کا جواب تھپڑ سے دیتا ہے، شیر کو چھیڑو تو ذرا کاٹ
کھائے گا، اونٹ کچھ نہیں کہتا، مسکرا کر معاف کر دیتا ہے
ہاتھی اپنی سونڈ سے وہ زور کا چابک رسید کرتا ہے کہ چودہ
طبق روشن ہو جاتے ہیں، چیتا اپنی دم سے گدگدیاں کرنے
لگتا ہے، گینڈا پہلے تو سوچتا رہتا ہے پھر یک لخت نزدیک
آ کر ایک زبردست دولتی مارتا ہے، دریائی بکرا چھیڑ کا جواب
چھیڑ سے دیتا ہے۔ لیکن جواب ضرور ملتا ہے۔ جواب
جواب میں بھی فرق ہے اور اگر محبت کا جواب محبت سے
نہ ملے تو زندگی بے کار ہے۔ اس صورت میں انسان کو
فوراً مر جانا چاہیئے، اگر وہ خود نہ مر سکے تو خودکشی کر لینی چاہیئے
خودکشی نہایت اچھی چیز ہے، صحت کے لئے مفید ہے۔
میں خود پانچ چھ مرتبہ خودکشی کر چکا ہوں —— معاف
کیجئے میرا مطلب ہے کہ خودکشی کرنے کی کوشش کر چکا ہوں
خودکشی کی کوشش کرنا بھی خودکشی کے برابر ہے، دونوں کا
ایک سا درجہ ہے، ایک ہی عزت ہے اور ایک سا ثواب
ہے۔ —— کھڑ کھڑ —— شوں جلاخ ——
چوں چوں —— میاں منحوس —— کھڑ ڑ
—— اب گیند وزیر علی نے نثار کی طرف پھینکی راستے
میں مشتاق علی نے گیند پکڑنے کی ناحق کوشش کی،
نثار نے گیند لے لی اب انھوں نے دوڑنا شروع کیا۔
اب وہ دوڑ رہے ہیں، وکٹوں تک پہنچے، اُچھلے وہ تیزی
سے گیند گئی، امرناتھ نے آگے بڑھ کر بلا گھمایا لیکن .....
..... نمک دو روپئے چھٹانک، گیہوں ساڑھے پندرہ آنے سیر

ماش پونے دو روپئے من، بیلوں کی جوڑی ستر روپئے کی، ہاتھیوں کی جوڑی چار سو روپئے کی، بندروں کی جوڑی مفت، اور الوؤں کی جوڑی بالکل مفت ......
ارے موہے پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گیو ری .....
موہے چھیڑ گیو ری ...... ساسا سے ماما ناری رکا گیو ری .... واسکوڈی گاما پا دھانی ساگیو ری
..... آج چھٹے مہینے کی چھٹی تاریخ ہے اور اس وقت چھ بجکر چھ منٹ ہیں اب آپ فارسی میں خبریں سنیئے یا چلنے رہنے دیجئے ——— کل دہلی میں پانچ منٹ بارش ہوئی تھی جس سے ملتان میں بڑی خوشیاں منائی جا رہی ہیں .... کھڑڑ کھڑڑ ..... ا"

اور میں نے جلدی سے ریڈیو بند کر دیا۔ اور دیر تک میں یہی سوچتا رہا کہ یہ کیا چیز تھی جو میں نے ابھی ابھی سنی اتنی دیر میں نے ریڈیو کو ہاتھ نہیں لگایا نہ سٹیشن بدلا۔ شاید غنودگی میں سن لیا ہو، یا میرے کانوں کی غلطی ہو، یہ ریڈیو کی غلطی تو ہو نہیں سکتی ویسے یہ غلطی ضرور تھی۔

میری یا ریڈیو کی۔

* * * * * * * *

خورشید احمد جامی

دھڑکنیں

بہ حسنِ خاص کوئی جلوہ گر ہے — جہانِ آب و گل زیر و زبر ہے

ہزاروں جس کے افسانے بنے ہیں — تمہاری ایک دزدیدہ نظر ہے

ترے صدقے۔ ابھی تک نامکمل — مرا افسانۂ دردِ جگر ہے

تری پلکیں بھی ہیں بھیگی ہوئی سی — تجھے بھی۔ کیا مرے دل کی خبر ہے

عنایت پر عنایت ہو رہی ہے — خدا معلوم کیا مدِّ نظر ہے

ارے توبہ حجاب بے حجابی — نظارہ بھی تو اب دشوار تر ہے

سنایا جا رہا ہے اک نظر میں — پیامِ شوق کتنا مختصر ہے

ترے روشن تبسم کی بدولت — مری ہر شام اب رشکِ سحر ہے

وطن سے دور جامی جا رہا ہوں
کسی کی یاد میری ہمسفر ہے

ماہر القادری

بمبئی سے جاتے ہوئے

جس کی ہر اہلِ نظر کو ہے تمنا اَے دُوست — لئے جاتا ہوں نگاہوں میں وہ دنیا اَے دُوست

نازنینوں کا وہ جمگھٹ وہ حسینوں کا ہجوم — شام کے وقت وہ نظارۂ دریا اَے دُوست

نغمہ و رقص کے طوفاں میں سفینہ دِل کا — ڈھونڈتا تھا کوئی خاموش کنارا[1] اَے دُوست

صبح کے وقت وہ ماحول شبستانوں کا — وہ مکانوں کے دریچوں کا نظارا[2] اے دُوست

کہیں ناموسِ حرم کفر کے آغوش میں تھا — لُٹ رہی تھی کہیں تقدیس کلیسا اَے دُوست

نرم شانوں کا تصادم وہ دمِ سیرِ چمن — میں نے مشکل ہی سے اپنے کو سنبھالا اے دُوست

وہ مرے شعر و ترنم پہ اَدائے تحسین — ہر غزل پر وہ نگاہوں کا اِشارہ اے دُوست

وہ مِرے واسطے سامان پذیرائی کے — اُس نوازش نے کہیں کا بھی نہ رکھا اے دُوست

اپنی مجبوری نگاہوں میں سِلئے جاتا ہوں — کتنی بے تاب نگاہوں کا تقاضا اے دُوست

اُس کا وہ ناز سے کہنا کہ ہمیں بھول گئے — مرتے دَم تک یہ مجھے یاد رہیگا اَے دُوست

مجھ کو ڈر ہے کہیں مغرور نہ ہو جاؤں میں — حسن نے اپنا ہی جیسا مجھے سمجھا اے دَوست

عیش و راحت نے بھی سرشار بنایا مجھ کو — تلخیوں کو بھی کیا میں نے گوارا اے دَوست

---

[1] کنارہ ۔ [2] نظارہ ۔

میری خاطر کہیں خود حسن نے اقدام کیا
میں نے دامن بڑی منت سے چھڑایا اے دوست

اور کہیں میں ہی بصد حسرت و امید بڑھا
اور کسی نے مجھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اے دوست

آہ! وہ رقص کے عالم میں گزرتی ہوئی رات
ہائے! وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں سویرا اے دوست

لوگ تو ظاہری باتوں پہ نظر رکھتے ہیں
مجھ کو افسوس کسی نے بھی نہ سمجھا اے دوست

پھر بھی طوفاں کی کشاکش میں بہت کافی ہے
ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا اے دوست

حسن کے لطف و توجہ سے بھی کیا ہوتا ہے
دردِ دل کا کوئی آسان ہی مداوا اے دوست

اس مدارات کی بس یاد ہی رہ جائیگی
لوٹ کر آ نہ سکے گا یہ زمانا[1] اے دوست

دلِ بے تاب کی آوارہ مزاجی کی قسم
اور دھوکے مجھے دے گی ابھی دنیا اے دوست

سرد مہری سے زمانہ کی اتر جائے گا
آرزوؤں کا یہ چڑھتا ہوا پارا[2] اے دوست

وعدۂ حسن بھی کیا عہد محبت بھی کیا
چند ترشے ہوئے الفاظ کا دھوکا اے دوست

حسن و الفت کی کشش میں بھی غرض شامل ہے
اس زمانہ میں نہیں کوئی کسی کا اے دوست

میرے اور تیرے سوا اور کوئی نہ ہو واقفِ راز
میں جو کہتا ہوں کسی سے بھی نہ کہنا اے دوست

---

[1] زمانہ ۔ [2] پارہ ۔

ریحانہ لدھیانوی

"فلسفۂ ہنر"

قوم جو آفاق میں تھی دشت پیمائے ہنر
ہے وہ با صد ناز و تمکیں مسند آرائے ہنر

جذبۂ کشور کشائی جب ہو زیر قصد کار
خود کو وہ ہو کا دے رہے ہیں شوق فرمائے ہنر

دشمنِ انسانیت ثابت ہو جب کسب کمال
کیوں زباں پر ہو نہ اُٹھے وائے تمنائے ہنر

نوعِ انساں کا ہنر ہو گا جب اخلاق بلند
بطنِ گیتی میں ہے وہ صبح مجلائے ہنر

ہے زمانے کو بھی حاصل عیب گیری میں کمال
اُسے سمجھتا ہے جو خود کو فرد یکتائے ہنر؟

ملک وہ، ہے غیر کا محکوم جس کا اقتصاد!
اُس کو ہے دشوار تشکیل تمنائے ہنر!!

ذیبؔ اگر دست سیاست میں رہا امروز علم
تو سمجھ خالی نہیں خطرے سے فردائے ہنر!

امیر احمد خسرو

حبّات

مست آنکھوں سے مئے پلائے جا
میری دُنیا پہ اور چھائے جا

نگہہ اِلتفات کے صدقے
خلش زندگی بڑھائے جا

یہ بھی احسان کم نہیں تیرا
عمر بھر یونہی دل دکھائے جا

مر نہ سکنے کا نام جینا ہے
تہمتِ زندگی اُٹھائے جا

مہربانی تیری فریب سہی
دل یہ کہتا ہے آزمائے جا

وضعداری تو ہے یہی خسروؔ
چوٹ کھا کھا کے مسکرائے جا

بنارسی مال کا تازہ ترین نایاب ذخیرہ جس میں بہتر سے بہتر نئی وضع کے پارچہ جات ہیں!
پردہ نشین خواتین کیلئے خاص انتظام
بالکل صحیح نرخوں کی گارنٹی
اکبر برادرس
عابد روڈ
حیدرآباد دکن
ٹیلیفون نمبر ۳۲۱۸

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

پیامِ ادب

ادارۂ تحریر

سید عبدالوہاب

(چودھری) محمد اقبال سلیم گاہندری

ادارۂ اشاعتِ اردو

عابد روڈ [illegible]

بنارسی مال کا تازہ ترین بہترین ذخیرہ
پردہ نشین
خواتین کے لیے
خاص انتظام
بالکل
صحیح
نرخوں
کی گارنٹی
اکبر برادرس
عابد روڈ
حیدرآباد دکن
ٹیلیفون نمبر ۳۲۱۸

مئی ۱۹۴۳ء

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۸

جلد (۲)

نمبر (۳)

مندرجات

چندہ سالانہ چھ روپے کلدار فی پرچہ آٹھ آنے کلدار

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن

نظرات

محمد اقبال سلیم گاہندری

ماہ اپریل میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس جبلپور میں منعقد ہوا، اور حسب دستور مختلف شعبوں میں تقاریر و خطبات کا مظاہرہ ہوا۔ ہم اس قدیم ادارے سے مایوس نہیں ہیں، ہمیں اب بھی اس سے بڑی امیدیں ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ اس میں کچھ نئے کام کرنے والوں کا اضافہ کیا جائے، بزرگانِ جہاں دیدہ کے تجربات اور اُن کی مہارت ہمارے لئے شمع راہ تو بن سکتی ہے لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم مضبوط پیروں کی توانائی سے بے نیاز ہو کر تعلیمی مہم کو سر کر سکیں۔ ضرورت ہے کہ کچھ نئے کام کرنے والے ہمدرد و پرعزم جوانوں کو ان بزرگوں کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع دیا جائے تجاویز مرتب فرمانا یقیناً بڑا اہم کام ہے، ہمیں انکار نہیں۔ مگر ان تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لئے پرعزم دل اور توانا جسم کی ضرورت ہے۔ . .

انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال تک مسلسل کوشش کی کہ ہندوستان کی عام زبان انگریزی ہو جائے مگر انھیں اس میں بری طرح ناکامی ہوئی اور ۱۹۴۱ء کی رپورٹ مردم شماری سے تو ظاہر ہے کہ اس طویل عرصہ کی کوشش کا ثمرہ صرف پونے دو فیصد انگریزی داں ہیں۔ اور بس ظاہر ہے کہ پونے دو فیصد آبادی کا انگریزی حروف سے واقف ہونا، انگریزی مقصد تعلیم کا فقدان ہے۔

انگریزی کی اس ناکامی کے بعد اب ہمیں خود اپنے ملک کے لئے یہ سوچنا باقی رہ جاتا ہے کہ عام زبان کیا ہو۔ غالباً اس بارے میں اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہا ہے کہ وہ زبان وہی ہو جو شمالی ہند (یو۔پی، اور بہار) میں ہر جگہ اور ہندوستان بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبات میں بولی جاتی ہے۔ جھگڑا صرف نام کا ہے، بعض حضرات اسے ہندی اور بعض اُردو کہتے ہیں۔ گاندھی جی نے اسے ہندی، ہندوستانی کا نام دیا ہے اور تعریف یہ کی ہے کہ یہ زبان اُردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی جاتی ہے۔ بہرحال یہی زبان ہے جو ہندوستان کی عام زبان بننے کا حق رکھتی ہے اور اس کے لئے اُردو یا ہندی، یا دونوں خط مستعمل ہیں۔

آج کل سپاہیوں کے لئے جو رسائل طبع ہو رہے ہیں اُن میں سے بعض رومن رسم الخط میں چھاپے جاتے ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں خطوط کو چھوڑ کر ہندوستان کی عام زبان کا رومن خط اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے بعض ہندوستانی بھائی بھی اس کوشش میں پیش پیش ہیں۔ یہ نقالی و طوطی صفت حضرات اتنا نہیں غور کرتے کہ ہندوستان میں انگریزی زبان کو عام زبان کا مقام دینے میں جو ناکامی ہوئی ہے، رومن خط کی ترویج اس ناکامی کو مبدل بہ کامیابی کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ اور تسلی کے لئے یہ "گرگا مالیدہ" بھی کافی سمجھا رہا ہے کہ زبان نہ بدل سکے تو کم از کم خط بدلنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

ڈاکٹر محمد حامد علی خاں صاحب وظیفہ یاب افسر صحت عامہ نے اپنی تمام عمر کا اندوختہ جو ۱ لاکھ روپیہ کی خطیر رقم ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اتنا بڑا ایثار ہے جس کی نظیر بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ پچھلے دنوں شہر حیدر آباد میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرنے کے لئے انجمن اشاعت تعلیم نے ایک جلسۂ عام معزز صدر المہام مالیہ کی صدارت میں کیا

منعقد کیا تھا۔ جلسہ میں مختلف مقررین نے اپنے اپنے تاثرات بیان کئے۔ اس جلسہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ وقف کسی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر نہیں کیا ہے اور نہ یہ دولت ڈاکٹر صاحب کو اتفاقی طور پر کسی تجارتی منافعہ کے ذریعہ ملی تھی بلکہ وہ اپنے زمانہ طالب علمی سے اس مقصد کے لئے اپنی آمدنی کا ایک حصہ انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ جمع کرتے رہے ہیں۔ اور اب اپنی پیرانہ سالی میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اس رقم کو وقف کر کے قوم کے ثقہ حضرات کو امین بنا دیں۔

رقم نو لاکھ ہوتی یا نو روپیہ۔ رقم کی کمی یا زیادتی اتنی اہم نہیں جتنا ڈاکٹر صاحب کا ایک مدت دراز تک جو غالباً چالیس پینتالیس سال کے طویل و عریض اور سرد و گرم زمانہ پر مشتمل تھی ایک مقصد اور بہترین مقصد کے لئے مستقل مزاجی کے ساتھ کوشاں رہنا، ہم سب کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

زندگی بھر میں کیسے کیسے وقت آتے ہیں، کیا کیا نہ ضروریات و حوادث پیش آتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا خلوص اور اس اخلاص پر یہ استقلال دیکھئے کہ کسی وقت انھوں نے اپنے مقصد کو نہیں چھوڑا۔ بچوں کی شادیاں کیں، بیمار پڑے ہوئیں، مکان بنائے، لیکن ہر جگہ کفایت کے ساتھ عمل ہوتا رہا تاکہ کچھ نہ کچھ اس مقصد عظیم کے لئے پس انداز ہو سکے۔

اردو زبان کے قدیم کرمفرما جناب پنڈت سمپورنانند جی سابق کانگریسی وزیر یوپی پچھلے ماہ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ انھوں نے ایک تقریر کے دوران میں بڑی معقول بات کہی۔ فرماتے ہیں:۔

اس ملک کے عوام بالخصوص ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر ایک زبان کے ارتقاء کی کوشش کریں خواہ اس کا نام کچھ ہی ہو لیکن یہ اس ملک کے عوام کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی ہو کہ سب اسے سمجھ سکیں اور سب کیلئے یہ آسان ہو۔"

اگرچہ اس میں لفظ "کچھ ہی ہو" پنڈت جی کی روحانی تکلیف کو کسی حد تک ظاہر کر رہا ہے لیکن ہمیں حیرت ہوتی اگر اردو کا نام لیکر پنڈت کچھ گل افشانی نہ فرماتے۔ بھلا پنڈت جی کہیں چوکتے ہیں اپنی تقریر میں اس کے بعد ہی دو اعتراضات انہوں نے ہم سب حیدرآبادیوں پر جڑ دیئے۔

(۱) آج کل جس قسم کی اردو تعلیم یافتہ لوگ بولتے ہیں اور لکھتے ہیں اس کو عوام نہیں بلکہ بعض مقامات کے مسلمان بھی اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۲) جامعہ عثمانیہ میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کی بجائے اردو کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

ان اعتراضوں کے متعلق ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ پنڈت جی شاید جانتے ہوں کہ دنیا میں کسی جگہ کی عوامی بولی اور علمی زبان بالکل یکساں ہوتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم ہے۔ اور ــــ دنیا کی کسی ایک جامعہ میں چار زبانیں کسطرح ذریعہ تعلیم بنائی جائیں یہ بھی وہ معمہ ہے جسے کوئی کانگریسی وزیر ہی حل کر سکتا ہے۔ ہمارے بس کی بات نہیں۔

اس تقریر میں پنڈت جی نے ایک اعتراض مسلمانوں پر کیا ہے کہ وہ یوم کراجیت میں کیوں شریک نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے مسلمان، اس کا جواب دیں، ہمیں مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل نہیں۔ دوسرا دعوی یہ کیا ہے کہ تلنگی کنڑی اور ملیالم سنسکرت سے بنی ہوئی زبانیں ہیں۔ بہت دلچسپ بات ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ تلنگی اور ملیالم سے سنسکرت بنی تھی یا سنسکرت سے یہ زبانیں بنی ہیں۔ ماہرین کی رائے تو یہ ہے کہ سنسکرت کہیں کسی زمانہ میں بھی عام بولی نہ تھی بلکہ ہندوستان کی ان ہی قدیم زبانوں سے الفاظ لے کر ایک فرضی مقدس زبان بنائی گئی تھی جو ادب عالیہ اور مذہب و فلسفہ کے لئے مستعمل تھی۔

بہرحال ہمیں ان امور سے متعلق کچھ کہنا نہیں، بات میں بات نکل آئی۔ اس لئے ذکر کر دیا گیا۔

ماہر القادری

عقیدت کے پھول

صدقے ترے آئینۂ ہستی کو نکھارا
قربان ترے گیسوئے فطرت کو سنوارا

اللہ رے! تری شوکت و اجلال کا عالم
قدموں پہ ترے لوٹ گئی سطوتِ دارا

آتے ہی ترے دوڑ گئی خنکئی توحید
تھمتا ہی نہ تھا کفر کا چڑھتا ہوا پارا

تو نے ہی محبت کے سفینہ کو ترایا
ملتا ہی نہ تھا حسن کے دریا کا کنارا

تاریخ کے صفحات کو بھی ناز ہے جس پر
اِک گرتی ہوئی قوم کو اس درجہ اُبھارا

چلتی ہی رہے گی ترے احکام کی کشتی
بہتا ہی رہے گا ترے الطاف کا دھارا

اُس وقت کہ مٹھی میں تری سارا عرب تھا
کہتے ہیں ترا نانِ جویں پہ تھا گزارا

اُس وقت بھی تھی تیری نبوت کی خدائی
آدم کی بھی تقدیر کا چمکا نہ تھا تارا

اب بھی تری عظمت پہ کٹا دیتے ہیں سر کو
اب بھی ہے ترا نام ہمیں جان سی پیارا

اب بھی ہیں تری نام کی عظمت کے فدائی
بغداد، فلسطین، سمرقند، بخارا

اے وہ کہ ترے ذکر میں تسکینِ دل و جان
اے وہ کہ تری ذات دو عالم کا سہارا

اے وہ کہ ترے نام سے ٹلتی ہے مصیبت
ماہر کی چشمِ عنایت کا اشارا

ادارۂ اشاعت اردو کی نئی کتابیں

	کتاب	مصنف	روپیہ آنہ پائی	نمبر
اِ	قصص و مسائل	مولانا عبدالماجد دریابادی	۱ ۸ ۰	۱
د	ضربیں	تپسی رام پوری	۴ ۰ ۰	۲
ا	زلزلے	قدوس صہبائی	۲ ۱۲ ۰	۳
ر	انگڑائیاں	احمد ندیم قاسمی	۳ ۴ ۰	۴
ۂ	سیلاب	″	۳ ۸ ۰	۵
ا	زندگی کی ٹھوکریں	رئیس احمد جعفری	۳ ۴ ۰	۶
شا	کردار	ماہر القادری	۲ ۴ ۰	۷
عت	رنگین سپنے	کوثر چاند پوری	۲ ۱۲ ۰	۸
ا	تقدیریں	منظور بخاری	۱ ۰ ۰	۹
ر	ہٹلر کا نیا نظام	امتیاز حسین۔بی۔کام	۰ ۱۰ ۰	۱۰
د	خدا اور کائنات	ماہر القادری	۰ ۹ ۰	۱۱
و	شادی و محبت	مقصودہ نزہت	۰ ۱۲ ۰	۱۲
عا	تذکرۂ یوروپین شعراء اردو	محمد سردار علی	۰ ۱۲ ۰	۱۳
بد	پریم پجارن	قدوس صہبائی	۰ ۱۴ ۰	۱۴
ر	سیاروں پر زندگی کے امکانات	محمد عبدالرحمن	۰ ۹ ۰	۱۵
و	بخارا کا جمہوری انقلاب		۰ ۹ ۰	۱۶
ڈ	ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر		۰ ۹ ۰	۱۷
حیدرآباد دکن	مرد انقلاب (شہزادۂ کرو پاٹکن کے حالات)		۰ ۱۲ ۰	۱۸

ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

صلاح الدین احمد

کہنے کی باتیں

"ادبی دنیا" کے ایڈیٹر نے جو دنیائے اَدب میں اپنی بالغ نظری اور ژرف نگاہی کے لئے کافی شہرت رکھتے ہیں اس مضمون میں خواجہ احمد عباس کے ایک افسانہ "بارہ گھنٹے" پر اپنی جوہر شناس نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ سنگسا روں کو یہ دھوکہ کہ بازکاروباری کس طرح جوہر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس ترقی پسند اَدیب ہیں۔ اور ترقی پسندی کا مفہوم چونکہ صرف اسی قدر ہے کہ جنسی بے راہ روی اور شہوانی مزاج کی تبلیغ و اشاعت کی جائے اور اس بھونڈے پن سے کی جائے کہ بڑے سے بڑا سیاہ کار بھی شرما جائے۔ خواجہ صاحب بھی اسی مقصد کے لئے لکھتے ہیں۔

صلاح الدین صاحب نے ان کی اِس اشتہار بازی کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ "اَدارہ"

ہمارے افسانہ نِگاروں میں جتنے اچھے لکھنے والے آج آپ کو نظر آتے ہیں، اُن میں سے بیشتر "ترقی پسندی" کا خوشنما لیبل ایجاد ہونے سے پہلے بھی لکھا کرتے تھے۔ اور ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ اُن کے فن پر نام نہاد "ترقی پسند" مقاصد اَثر انداز نہیں ہوئے۔ جو موضوعات آج سے دس برس پہلے اُن کے سامنے تھے وہ آج بھی موجود ہیں۔ اور جس داخلی تحریک سے مجبور ہو کر وہ پہلے قلم اُٹھاتے تھے، وہ آج بھی اُنہیں بے چین کر سکتی ہے اور کرتی رہتی ہے۔ لیکن آپ کو اُن میں ملے جُلے بعض ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے، جنھوں نے فن کو فن کا مقدس مرتبہ نہیں دیا۔ اور اُس کی قربان گاہ پر کوئی بھینٹ نہیں چڑھائی۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری کو اخبار نویسی کی طرح چند مقاصد کے نشر کا ایک ذریعہ قرار دیا اور جس طرح اُن سے بن پڑا اُسے اِستعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ ان لوگوں میں خواجہ احمد عباس کا نام نامی ایک اِمتیازی درجہ رکھتا ہے۔

حال ہی میں اخبار "مصور" بمبئی کے ماہوار ایڈیشن میں آپ کا ایک ڈراما اور ایک افسانہ چھپا ہے۔ ڈراما تو خیر اپنی اِنتہائی ناپختگی اور اشتہاری کیفیت کے باعث اِس قابل نہیں کہ اس کا نوٹس لیا جائے۔ لیکن افسانہ جس کا نام "بارہ گھنٹے" ہے اپنی بعض خصوصیات کے اِعتبار سے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں "ترقی پسندی" اور کمیونزم کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور وہ حضرات جو اپنے عقائد کے لحاظ سے کمیونسٹ واقع ہوئے ہیں، فنی تخلیقات کو بھی اپنے مخصوص مقاصد کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس، جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ ایک بڑے جیتے جاگتے کمیونسٹ ہیں، اور اُن کی اکثر تحریروں اور "فن پاروں" پر ایک گہرا اِشتراکی رنگ چڑھا رہتا ہے۔ اُن کی موجودہ تخلیق کا ہیرو بھی ایک اِنقلاب پسند نوجوان ہے۔ "کامریڈ وجے سنگھ" جو سولہ برس کے بعد (یاد رہے کہ عمر قید بھی چودہ برس سے زائد نہیں ہوتی اور وہ بھی کٹ کٹا کر دس گیارہ برس رہ جاتی ہے) جیل سے رہا ہو کر آیا ہے، اور پارٹی کے صدر مقام میں پہنچنے سے پہلے پارٹی کے سکرٹری کی ہدایت کے مطابق راستے میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اُتر جاتا ہے۔ جہاں پارٹی کی ایک خاتون ممبر مینا اُس کی "میزبانی" کے فرائض انجام دیتی ہے۔ سکرٹری صاحب کو خدشہ ہے کہ وجے سنگھ کو صدر مقام پہنچتے ہی

پھر گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس لئے وہ بینا کو لکھتے ہیں کہ "ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ جیل خانے سے پہلے وہ کم از کم بارہ گھنٹے تو آزاد رہے" اور اس کے بعد رات کے ان بارہ گھنٹوں کی سرگذشت شروع ہوتی ہے جو دراصل کہانی کی جان ہے۔

ہم نے جب تک یہ افسانہ نہیں پڑھا تھا ہم آن لوگوں کی بات پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ جو کہا کرتے ہیں کہ ہمارے بعض "ترقی پسند" دوست عورت کی عصمت اور سوسائٹی میں اس کی قدر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن یہ افسانہ پڑھ کر جو بجائے خود پراپیگنڈے کا ایک شاہکار ہے، ہم بادلِ ناخواستہ اپنی رائے پر نظرِ ثانی کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔

فن برائے فن کے اصول کا رہیں ایک بڑی جہت یہ ہے کہ فن کار کسی چیز کی تبلیغ نہیں کرتا۔ وہ زندگی کو جس طرح دیکھتا ہے، اس طرح پیش کر دیتا ہے۔ لیکن جس فن کے ہمارے "ترقی پسند" دوست قائل ہیں وہ فن "برائے زندگی" ہے اور اپنے اندر ایک زبردست تبلیغی مقصد رکھتا ہے۔ اس لئے ان افسانوں میں جو محض فنی نقطۂ نگاہ سے لکھے جائیں، اور ان میں، جو کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے جائیں، ایک بہت بڑا فرق یہ پڑ جاتا ہے کہ افسانے کے "پیغام" کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والے پر عائد ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ فن کو ہر قسم کی تبلیغ و اشاعت سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے اصلاح پسند دوست ایک طرف اور ترقی پسند احباب دوسری جانب اسپ تازی سے گدھے کا کام لینا چاہتے ہیں اور اپنے اپنے بوجھ اس طرح اس پر لادتے چلے جاتے ہیں کہ حیرت ہے کہ یہ اب تک زندہ کیونکر ہے۔ گریہ بھی کوئی دن کی بات ہے، ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ یا تو یہ گدھا نہیں رہے گا یا خود لادنے والے ختم ہو جائیں گے۔

ہم تو یہی بات ہے، فن میں ان رجحانات کے بھی مخالف ہیں جنہیں عام طور پر اصلاحی کہا جاتا ہے۔ ہم ہرگز اس تخلیق کو فنی تخلیق نہیں کہیں گے جو محض کسی معاشرتی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے معرضِ وجود میں لائی گئی ہو، چہ جائیکہ ایسی تحریروں کو فن میں جگہ دی جائے جو صریحاً تخریبی عناصر کی حامل ہوں۔ اگر آپ سوسائٹی کے جسم کے پھوڑے ہمیں دکھانا چاہتے ہیں تو شوق سے دکھائیے۔ جب تک آپ کے دکھانے کا انداز فن کارانہ ہے۔ کسی کو یارا نہیں کہ وہ آپ پر حرف گیری کر سکے۔ لیکن اگر آپ سوسائٹی کے چنگے بھلے جسم میں خیالی پھوڑے پیدا کر کے ان پھوڑوں کے فوائد کا پراپیگنڈا کرتے ہیں تو ہم میں سے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ آپ کو فن کاروں کی محفل میں آنے سے روک دے اور اگر آپ کسی طرح گھس آئے ہیں تو آپ کو دروازے کا راستہ دکھا دے۔

زیرِ نظر افسانے کے مصنف نے اپنے نظریے کو صاف صاف پیش کرنے سے پیشتر اپنا راستہ آہستہ آہستہ یوں صاف کیا ہے:۔

ان حالات میں ایک غیر مرد کا اکیلے مکان میں اس کے ساتھ رات گذارنا ..... لوگ کیا کہیں گے ..... قدرت نے از خود اس کے بدن میں ایک عجیب سی گدگدی، ایک عجیب سی چبھن ایک میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیا تھا (الحق) وہ جانتی تھی کہ اس کی ایک ہی دوا ہے مگر شادی سے پہلے اس دوا کی خوراک پینا یہ بھی تو اتنا آسان نہ تھا۔"

"آسان" کی بھی خوب رہی، مگر ذرا آگے چلئے۔

"بینا نے پارٹی کے دفتر میں لگی ہوئی دبے سنگھ کی تصویر دیکھی تھی شاندار وجیہہ جوان چوڑا چکلا سینہ اونچی پیشانی۔ خوبصورت آنکھیں۔ ناممکن تھا کہ کوئی ان آنکھوں کو دیکھے اور ان کا شکار نہ ہو جائے بینا نے ان آنکھوں سے انقلاب کا سبق سیکھا تھا (شاباش) اپنے اصولوں کے لئے مرمٹنے کی تمنا اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی حسرت سب کچھ جان۔ مال

عورت۔ ہاں عورت بھی (آدم بر سرِ مطلب!) ان میں ایک ہیجانی کشش بھی تھی۔ ایک جنون انگیز شرارہ۔ ممنوعہ لذتوں کا ایک اشارہ۔ اس دلفریب دنیا کی ایک جھلک جس کا دروازہ سماج نے بینا جیسی غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے بند کر رکھا تھا۔ مگر یہ دروازہ توڑا بھی جا سکتا ہے۔ بینا اپنی پارٹی ہی میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی جنہوں نے اس خیالی دروازے کو توڑ کر آزاد جنسی تعلقات کی سرزمین میں قدم رکھا تھا۔ کیا آج کی رات وہ بھی وجے سنگھ کی مدد سے ...... ؟" (جی ہاں کیوں نہیں)۔

اور اس طرح اپنی زمین کو ہموار کرتا ہوا، افسانہ نگار بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جب بینا ایک کمرے میں اور وجے سنگھ جو سولہ برس کی قید کاٹنے کے بعد شکل و صورت کے لحاظ سے بہت کچھ بدل چکا ہے، دوسرے کمرے میں بظاہر سو رہے ہیں لیکن دراصل ایک جنسی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وجے سنگھ کے ایک داڑھی بھی اگ آئی ہے جو آدھی کالی ہے اور آدھی سفید۔ اور اس کے دانت بھی زرد ہیں اور ناخن بھی میل سے بھرپور ہیں (ہمارے ایک دوست کے قول کے مطابق بعض "ترقی پسند" حضرات جسم کی ظاہری صفائی کا ایسا ہی معیار اپنے سامنے رکھتے ہیں) اور یہ بھی سچ ہے کہ اس نے بینا کے کہنے کے باوجود اپنی طرف کی چٹخنی نہیں لگائی اور بینا کی طرف تو چٹخنی ہی نہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ بینا ابھی ابھی اسے بولتا سینما دکھا کر لائی ہے۔ جس نے اس کے سوئے ہوئے جذبات بیدار کر دئیے ہیں۔ مگر

"بینا کے حساس ہمدرد دماغ نے اسی صورت حال کو دوسری طرح یوں پیش کیا "بے شک وجے سنگھ قبل از وقت بڈھا ہو چکا ہے۔ اس کے چہرے پر خوفناک ڈاڑھی ہے۔ اس کی پیشانی پر جھریاں ہیں اس کے منہ سے زرد اور گندے دانت جھانک رہے ہیں۔ مگر کیوں بینا؟ سوچ۔ سولہ برس ہوئے یہی وجے سنگھ ایک خوبصورت کڑیل جوان تھا...... وہ کیوں اپنی جوانی، اپنا حسن اپنی تندرستی کھو بیٹھا؟ انقلاب کے لئے۔ بینا انقلاب کے لئے اسی انقلاب کے لئے جس کی خاطر تو جان دینے کو تیار ہے مگر تو تو باتیں بناتی ہے۔ اس نے کر دکھایا.....

اور تو، تیرا دل اتنا چھوٹا ہے کہ آج تو اس وجے سنگھ کی داڑھی۔ اس کی جھریوں اور اس کی پھنسیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے ــــ لعنت ہے تجھ پر...... وہ حساس ہے۔ اس کو اپنی بدصورتی کا علم ہے۔ وہ تجھے چھیڑنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اگر تو اس کے کمرے میں نہیں جائے گی۔ تو وہ رات بھر ٹہل کر گذار دیگا۔ اور صبح کو ایک لفظ کہے بغیر پھر جیل چلا جائیگا ــــ مگر تو نے اس کو مایوس لوٹ جانے دیا تو اپنے آپ کو تو کبھی معاف نہیں کر سکے گی اس کی حسرت اور آرزو بھری نگاہیں ہمیشہ تیرا پیچھا کرتی رہیں گی..... وجے سنگھ اپنی پیاس کو ساتھ لئے واپس چلا جائیگا۔ وہ جس نے اپنی جان قوم کی آزادی اور انقلاب کے لئے قربان کر دی تھی۔ اس کے واسطے ایک عورت چند گھنٹے کے لئے اپنا جسم بھی دینے کو تیار نہ ہو گی ــــ نہیں وہ ایسا نہ ہونے دے گی۔ اس نے اپنی جان انقلاب کے لئے وقف کر دی تھی۔ اپنی جان اور اپنا جسم اور اپنی عصمت بھی۔ وجے سنگھ کی قربانیوں کے سامنے اس کے حقیر جسم کی کیا وقعت تھی۔ اس کے بدن میں وجے سنگھ کو چند لمحوں کے لئے ہی سہی، پھولوں کی بہار، بچوں کی آواز۔ ماں کی ممتا۔ موسیقی کی جھنکار۔ غروب آفتاب کی رنگینی برسات کی رم جھم سب کچھ مل جائیگا۔ اور آئندہ زمانے میں...... جب وہ جیل کی سختیوں سے تنگ آکر دنیا اور زندگی کی طرف سے مایوس ہونے لگے گا تو اُن سے چند گھنٹوں کی یاد آئے گی۔ ایک لڑکی کی یاد، ایک نوجوان جسم کی یاد ــــ

اور وہ اپنے جسم اور دماغ اور دل کو زندہ رکھے گا ہندوستان کی خاطر، انقلاب کی خاطر، اور پھر جب ملک آزاد ہو جائیگا ..... تو اس وقت شاید وجے سنگھ بینا کا نام بھی بھول جائیگا۔ انقلابی حکومت کو چلانے کے کام میں اس کو ایک گمنام لڑکی کو یاد کرنے کی کب فرصت ہوگی مگر اس وقت بینا کا وہ احساس فتح نصیب ہوگا جو ایک آرٹسٹ کو اپنا شاہکار دیکھ کر نصیب ہوتا ہے ــــ بینا اٹھی دروازہ کھولا اور (وجے سنگھ کے) کمرے میں چلی گئی۔"

جگہ کی کمی کے باعث ہم ترغیب و تحریص کے اس شاہکار کا مفصل اقتباس پیش نہیں کر سکے، مگر آپنے دیکھ لیا کہ جب کوئی شخص اپنی سعی کرنے پہ تل جاتا ہے تو کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ اے آزادی! اور اے ادب! وہ کونسے مظالم تھے جو تمہارے نام پر نہیں توڑے گئے اور وہ کونسی بدلگامیاں تھیں جو تمہارے نام پر اختیار نہیں کی گئیں۔

عورت کا جوہر عصمت جو شرف انسانی کا سب سے بڑا نشان اور سماج کا سب سے بڑا سہارا ہے آج اس قدر ارزاں سمجھا جانے لگا کہ اسے ایک طبقے کی سیاسی تحریک میں عورت کی طرف سے ایک ناچیز ہدیے بلکہ "چندے" کا درجہ دیا جارہا ہے اور قوم کی نوجوان لڑکیوں کے شعور پر یہ نقش ثبت کرنیکی کوشش کیجا رہی ہے کہ عصمت و عفت بالکل خیالی چیزیں ہیں اور اس "دلفریب دنیا کا دروازہ جسے سماج نے غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے بند کر رکھا ہے" قومی کام کرنے والے نوجوانوں کی "مدد سے" نہایت آسانی سے "توڑا جا سکتا ہے" اور توڑا جانا چاہیئے کیونکہ اس سے گزر کر وہ "آزاد جنسی" تعلقات" کی جنت میں قدم رکھ سکیں گی۔ اور وجے سنگھ جیسے شاہکار تیار کرنے میں مدد دے سکیں گی۔

اخلاقی بدلگامی کے اس ترغیب نامے کو جسے افسانہ کہنا افسانہ نگاری کی توہین ہے، اگر خالص فنی نقطۂ نظر سے بھی جانچا جائے تو اشتہاریت کے اس گھناؤنے عنصر کے علاوہ اس میں صناعت کی بھی نہایت مضحکہ خیز کمزوریاں ہیں کامریڈ وجے سنگھ کو جیل سے باہر صرف ایک رات بسر کرنی ہے اور وہ اسی رات میں اپنی سولہ برس کی جنسی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔ اس نے بینا کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس لئے عشق و عاشقی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک عورت چاہتا ہے، صرف ایک عورت۔ بلکہ عورت کا جسم ــ بینا کے جسم سے اسے کوئی خصوصیت نہیں۔ اسے ایسی افلاطونی محبت درکار نہیں جو اس کے کسی قدر دان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بینا اگر اسے دیوتا سمجھ کر پوجتی اور ماں کی طرح چاہتی تب بھی اسکی جنسی پیاس میں رتی بھر کمی نہ ہوتی۔ پھر اس کے لئے کیا ضرور تھا کہ وہ اسے بجھانے کے لئے ایک ناکتخدا شریف زادی کا جوہر عصمت طلب کرتا اور اس کی یادگار میں اسے ایک حرامی بچہ دے جاتا۔ اس کے لئے یہ ایک نہایت آسان بات تھی کہ چپکے سے نکل کر چکلے میں چلا جاتا اور وہاں بینا کے جسم سے کہیں بہتر جسم سے وہ چیز حاصل کر لیتا جس کی درحقیقت اسے ضرورت تھی۔ آخر وہ قصبہ جہاں ایک سینما ہو سکتا ہے، وہاں ایک پانچ روپے والی رنڈی بھی مل سکتی ہے۔ مگر افسانہ نگار یہ ممکنات نہایت آسانی سے نظر انداز کر جاتا ہے کیونکہ اس کی نظر فن پر نہیں بلکہ جنسی بے راہ روی کے اشتہار پر ہے۔ خواجہ صاحب کا یہ اجتہادی افسانہ پڑھکر ہمیں قدیم کلیسائے روما کی وہ کنواریاں یاد آجاتی ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو "خادمان دین" کی جنسی خدمت کے لئے وقف کر دیتی تھیں یا پھر جنوبی ہند کی وہ دیوداسیاں جو مندروں پر اس لئے چڑہا دی جاتی تھیں کہ تمام عمر "مردان راہ خدا" کے کام آئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ "پولیٹیکل دیوداسیوں" کا یہ نیا تصور ہمارے "ترقی پسند" طقوں میں کیا رنگ لاتا ہے۔

علی اختر

پیامِ اقبال

شبِ گزشتہ، نظر آئے حضرتِ اقبال
حریف ہوش و خرد تھا مرا یہ عالمِ خواب

وہی شگفتہ مزاجی، وہی جمال اُن کا
وہی نگاہ، وہی دل پذیر طرزِ خطاب

کہا یہ میں نے کہ اے آشنائے سرِ عمیق
تری نگاہ، حقیقت شناسِ خوب و خراب

جو تو نے مطربِ پاکیزہ لحن چھیڑی تھی
ہنوز تازہ ہے وہ سرمدی نوائے رباب

خزاں پرستیِ اربابِ دہر کیا کہیئے
کھٹک رہا ہے نظر میں تری چمن کا گلاب

کسی کو وہم کہ موضوع ہے ترا مذہب
ترا خیال ہے مسلم کے عہدِ رفتہ کا خواب

گماں کسی کو کہ تیری زبان ہے بے تاثیر
عروسِ فکر کے رُخ سے ہٹا نہیں ہے نقاب

میں تیری فکر کا محرم سہی مگر دُنیا
تجھی سے چاہتی ہے نکتہ چینیوں کا جواب

سُنا یہ مجھ سے تو اقبال مسکرانے لگے
پھر اپنی خاص ادا میں مجھے دیا یہ پیام

یہ پیرِ مکتبِ ناآگہی کے حلقہ بگوش
سمجھ سکیں گے ابھی کیا مری خودی کا مقام

مجھے نقیبِ حرم کہہ رہے ہیں وہ ناداں
دماغ بتکدہ جن کے، تصورات اِصنام

مرے جہاں کا ہر ذرہ، عالمِ انوار
یہ آب و خاک میں سمجھے ہیں زندگی کا نظام

مقامِ نور و سرور و حضور کیا جانیں
یہ دانتے کے پرستار، نیطشے کے غلام

وہ جلوہ پردۂ فاؤسٹ میں نہیں ملتا
دیا ہے عارفِ رومی نے جس کو منظرِ عام

میرا بیاں ہے حقیقت کا ترجماں لیکن
مری زباں ہے ناآشنائے نطقِ عوام

حقیقت ابدی ہے تہِ نقاب ہنوز
تہی پڑے ہیں بہت دن سے ظرفِ بادہ و جام

مگر بساط اُلٹنے کو ہے زمانے کی
نئے نظام کی تمہید ہے کشاکشِ عام

فضائے دہر میں طوفاں کی آمد آمد ہے
کہ بطنِ موج میں تازہ ہوا ہے ذوقِ خرام

مُسلم ضیائی
ایم۔ اے (عثمانیہ)

اِسکول ماسٹر

اُدھیڑ عمر کے ایک رئیس نے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے گاڑیبان کو پکارا جو اُس کے مکان کے سامنے سے بیل گاڑی لئے چلا جا رہا تھا۔

"اے! اے۔ پرو کوئی! پرو کوئی!"

گاڑی ٹھہر گئی۔

"بہرا ہے کیا؟"

گڑی گڑی ناڈرمج! پہیوں سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں کہ سنائی ہی نہیں دیتا کچھ۔ اُنھیں تیل کی ضرورت ہے اُن کو۔"

"اوہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ گاڑی میں کیا ہے؟ پانی؟"

"جی ہاں"

"تالاب سے لائے ہو؟"

"جی"۔

"اچھا" رئیس نے ذرا دیر بعد کہا "جا سکتے ہو"

ایک سپاہی نے برآمدے تک آکر کہا "سرکار کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں"

"کون ہو تم؟"

"فرخو ضلع مرکورنسکی سے آیا ہوں آپ تو جانتے ہوں گے؟ —— دریائے کوستر اکے کنارے"

"کیا چاہتے ہو؟"

"نوکری کی تلاش میں ہوں بطور دربان یا قرق امین؟"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے؟"

"فوج میں ملازم تھا۔ پیدہ سالار رکاکوچوان۔ اس کے بعد مورانکی میں مجسٹریٹ صاحب کا باورچی رہا سرکار میں ہر فن مولا ہوں —— مالی، کتوں کا نگہبان، باورچی —— جو خدمت آپ لینا چاہیں"

"کیا پتھر توڑ سکتے ہو؟"

"نہیں۔ مجھ سے ایسا کام نہیں ہو سکتا"

"کیوں؟"

"حضور بات یہ ہے کہ فوجی زندگی انسان کا سانس بل نکال لیتی ہے۔ میں فوج کے ہراول میں تھا! عقبی فوج میں نہیں تھا"

"اچھے خاصے صحت مند ہونے پر بھی ایسے ادنیٰ کام کیوں کرنا چاہتے ہو؟ بھلا سوچو تو کہ قرق امینی اور کتوں کی نگہبانی بھی کوئی کام ہے؟"

"لیکن سرکار پتھر توڑنے سے تو بہتر ہے"

"میرے خیال میں تو پتھر توڑنا بہترین کام ہے ..... خیر ..... کیا تمہارے پاس سرٹیفکٹ ہیں؟"

"جی نہیں حضور"

"بلا سرٹیفکٹ کے میں تمہیں ملازم نہیں رکھ سکتا"

"درست ہے سرکار"

"تم بالکل نکمے اور ناکارہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔

چور یا شرابی۔ . . "

"جی سرکار"

"تمہیں سرٹیفکٹ لانا چاہیئے"

"جی سرکار"

"آداب عرض"

سپاہی چلا گیا۔ اِتنے میں داروغہ نے حاضر ہو کر کہا۔

"سرکار جس وقت آرام فرما رہے تھے ایک اَجنبی آیا تھا۔ کسی گاؤں کے مدرسے میں پڑھاتا ہے"

"اب کہاں ہے"

"دفتر میں بیٹھا ہوا ہے"

"حاضر کرو"

تقریباً چالیس سالہ شخص برآمدے میں داخل ہوا رئیس نے بیٹھنے کے لئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"کون ہو تم"

"بزروبوٹ ضلع پوبیرا کا اِسکول ماسٹر۔ حضور کی خدمت میں ایک گذارش ہے۔ کیا حضور کے پاس ملازمت مل سکتی ہے۔"

"مجھے کسی اِسکول ماسٹر کی ضرورت نہیں" رئیس نے کہا۔

"میں کوئی دوسری خدمت بھی انجام دے سکتا ہوں سُنا ہے کہ حضور کو ایک منشی کی ضرورت ہے"

"بزروبوٹ میں تم نے ملازمت کیوں چھوڑ دی"

"اِسکول میں آگ لگ گئی اور جل کر خاک سیاہ ہوگیا"

"عرصہ ہوا کیا ؟"

"یوم اَولیاء کے موقع پر۔ آگ لگنے کا سبب نہیں معلوم ہو سکا ———— سارا گاؤں جل گیا"

"ہاں آج کل مسلسل آگ لگنے کی خبریں آرہی ہیں۔ یہاں سے قریب ہی ایک گاؤں کے جل جانے کی اطلاع آئی ہے"

لیکن یہ تو بتایئے کہ جناب مدرس کیوں کر بن گئے ؟

"تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ رہا۔ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بھائی میری کفالت کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک رئیس کے پاس دو روپل ماہانہ پر نوکر ہوگیا۔ مگر وہاں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکا۔ جب تک نوکر رہا کوچوانی کے فرائض انجام دیتا رہا . . . . . ."

"لیکن یہ کیوں ؟"

بات یہ تھی کہ میرے شاگرد کو پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا۔ اُس کے ماں باپ نے اُسے آزاد چھوڑ رکھا تھا اس لئے اُنھوں نے مجھ سے عارضی طور پر کوچوانی کا کام لیا"

"خوب !!"

"میں کام اچھی طرح کرتا تھا۔ مجبور تھا کیونکہ کوئی دوسرا . . . . . ."

اُتنا کیا تھا ؟

"کچھ نہیں۔ صرف رہنا کھانا یا ایک اترا ہوا ڈریسنگ گون جو رئیس نے عنایت کیا تھا۔ یہی ڈریسنگ گون پہنے ہوئے میں اپنے بھائی کے پاس گیا لیکن اُنھوں نے کہا " یہاں کیا کرنے آئے ہو نکھٹو کہیں کے۔ کوئی کام کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ گانا ہی ——— ممکن ہے کسی وقت " اُستاد " ہو جاؤ"

میں نے گانا سیکھنا شروع کیا لیکن بھائی نے میرے گانے سے بیزار ہو کر ایک دن کہا " اُفوہ ! ۔ بیزار ہوگیا ہوں۔ ناقابلِ برداشت ہے تمہارا گانا ۔ بہتر ہے تم اَبّا جان کے پاس چلے جاؤ"

گھر پہنچا تو سب نے بُرا بھلا کہنا شروع کیا "بیکار نکما وغیرہ" بھلا آپ ہی بتایئے سرکار۔ ملازمت ہی نہ ملے تو میں کیا کروں ؟ میں نے ایک مرتبہ یہ بھی سوچا کہ رہبانیت اختیار کر کے کسی خانقاہ میں جا رہوں لیکن اُسی زمانے میں ایک خط میرے بھائی کے پاس سے

آیا جس میں مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ میرے جانے پر انہوں نے کہا: "شاہزادہ کا داروغہ ایک سنگیت پارٹی قایم کرنا چاہتا ہے۔ تم "اُستاد" کی حیثیت سے ملازم ہو جاؤ۔"
میں نے کہا: "آپ جانتے ہیں میں گانا نہیں جانتا پھر کیونکر اُستاد بن سکتا ہوں۔" لیکن بھائی نے کہا: "گھبراؤ نہیں۔ تم اپنی جماعت کو تعلیم دینا سیکھ جاؤ گے۔" میں نے ملازمت اختیار کر لی۔

اُنھوں نے مجھے ——"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اُس وقت آپ ڈریسنگ گون پہنے ہوئے تھے؟"

"جی نہیں۔ میں اپنی ماں کا کوٹ پہنے تھا۔ ڈریسنگ گون پھٹ چکا تھا ...... یہ ایک چھوٹا کوٹ تھا.... گھر کا بنا ہوا......"

"اچھا۔ پھر؟"

"کام اچھا ہو رہا تھا۔ سنگیت میں کافی تعداد تھی میرا بھائی اونچے سروں میں گاتا اور انیوان الکسیج نیچے سروں میں۔ آج کل وہ انجیل کی تفسیر اور گرداوری کی تعلیم دیتا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ بعض لوگ شوقیہ شریک تھے۔ ہم لوگوں نے بہت جلد روسی گیتوں کی اچھی مشق بہم پہنچائی۔ داروغہ صاحب کو ہم لوگوں کی مشق دیکھ کر بڑی حیرت تھی۔ موسیقی میں اس کی نگاہ بڑی گہری تھی۔ چنانچہ اس نے شاہزادے کے پاس جو ماسکو میں تھے خط بھیجا جس میں "اُستاد" کے لئے تنخواہ مقرر کرنے کے لئے لکھا تھا۔ اس اثنا میں ہم نے دوسرے گیتوں اور راگوں میں مشق بہم پہنچانی شروع کر دی تھی۔ یکایک شہزادے کے پاس سے جواب آیا۔ سنگیت کی ضرورت نہیں میں اپنی صحت کی خاطر باہر جا رہا ہوں ——"

"اس کے بعد میں موضع بزدبونس کے مدرسہ میں اسکول ماسٹر ہو گیا۔ یہاں کے رہنے والے بڑے غریب ہیں۔ سردی کے دنوں میں بہت سے کسان اپنی بھٹیوں میں سوتے ہیں۔ ایک روز اتفاق سے ایک پادری صاحب اس گاؤں میں باہر سے آگئے اور ایک گھر میں داخل ہو کر انھوں نے آواز دی لیکن کسی کا پتہ نہ تھا اس پر انھوں نے ایک مناجات گانی شروع کی۔ یکایک لوگوں نے بھٹی سے رینگ رینگ کر نکلنا اور صلیب مقدس کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ میرے اکثر شاگرد بھیک مانگنے جایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود سینٹ پیٹر برگ کے ایک دولت مند رئیس نے جو ہمارے گاؤں سے گذرا تھا، کہا کہ لوگ تعلیم کے خلاف نہیں ہیں —— سچ مچ۔"

"کیا طنز سے کہہ رہے ہو؟"

"جی نہیں!!"

"واقعی غریب آدمی کو بھی علم حاصل کرنے کی خواہش ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر لومونوسوف ہی کو لے لو۔ وہ ایک معمولی کسان سے ترقی کر کے مجلس علمی کا رکن بن گیا ہے۔"

"درست ہے۔"

"اچھا سینٹ پیٹر برگ سے آئے ہوئے رئیس نے اور کیا کہا؟"

"اس نے کہا تھا کہ طالب علموں کے لئے اگر یونیفارم مقرر کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔"

"بڑا اچھا خیال ہے۔" رئیس نے زور سے کہا: "مدرسہ میں ضبط و نظم ہونا چاہئے۔ ضبط و نظم کے بغیر کوئی مدرسہ نہیں قایم رہ سکتا۔ فضول —— تمہارے اسکول میں کیا کیا پڑھایا جاتا ہے؟"

"عہد نامہ جدید روسی اور سلووانی زبان میں پڑھاتے تھے اور عہد نامہ قدیم و جدید سے ایک سو چار منتخبات، مسیحی مذہب کے مبادیات، زہد و اتقاء کی مثالیں اور دعائیں بچوں کو زبانی یاد کرائی جاتی تھیں اور اس کے بعد دوسری دعائیں اور مناجاتیں وغیرہ

"بس"
"جی نہیں" ہمارے پاس کتبخانہ میں حسب ذیل کتابیں تھیں۔
"تاریخ عالم کے منتخبات" مصنفہ شرک
"فوجی ملازمت میں داخلہ کی منظوری کے اصول"
"غذائے دل ودماغ"
"مناجاتیں"
"ہترا" مصنفہ گلنکا
"سینٹ پیروکو بیس ناجائز کی سوانح عمری"
"عوام کی کتاب"
"گھریلو بات چیت"
"گنی پستک"
اور چند کتابیں۔
"کتابیں تو اچھی ہیں" میں نے کہا میں "گھریلو بات چیت" اور "گنی پستک" منگواؤں گا۔ تم وہاں کب تک ملازم رہے"
"آٹھ سال۔ اس تمام عرصہ میں میری تنخواہ نہیں بڑھی۔ ایک روز انسپکٹر صاحب آئے۔ انھوں نے پوچھا "تم کتنے عرصہ سے کام کر رہے ہو؟"
"آٹھ سال سے" میں نے جواب دیا۔
"تمہاری تنخواہ میں اضافہ ہوا؟"
"جی نہیں" میں نے جواب دیا "مجھے اتنی ہی تنخواہ دی جاتی ہے"
"کیوں؟"
"معلوم نہیں"
اس پر انسپکٹر نے افسر ضلع سے کہا "مدرس کی تنخواہ بڑھنی چاہیئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مدرسہ کی پھلواری پر توجہ نہیں کی جارہی ہے۔ اس لئے اسے درست ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا اخلاقی اثر طلبہ کے دلوں پر بہتر ہوگا جو بعد میں کسان بن جائیں گے"

"مجھے اس سے اتفاق ہے۔ ان لوگوں کے بُرے رجحانات بچپن ہی سے بدل دینے چاہئیں۔
"انسپکٹر نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ باغ میں پھول لوٹے جائیں اور ــــــ"
"خفقان۔ میرے خیال میں یہ غیر ضروری ہے اسے چاہیئے تھا کہ برچ کے درخت لگانے کا حکم دیتا ان کا اثر طلبہ پر کہیں زیادہ بہتر ہوگا"
"برچ کے درخت پہلے سے موجود تھے"
"برچ کے درخت اتنے ہی قیمتی ہیں جتنی "گنی پستک" یا "گھریلو بات چیت" کیا تمہاری شادی ہوچکی ہے"
"میں شادی کرلیتا لیکن مجھے خوف تھا اور گوزدف کے پادری نے مجھ سے اپنی سالی کے بارے میں کہا تھا۔
"میں اس سے ملنے گیا"
"کیا وہ عقلمند تھی"
"جی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ عقلمند تھی یا نہیں"
"لیکن تم نے اس سے درخواست کی تھی؟"
"جی ہاں۔ یہ تو درست ہے۔ ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ او لگا منڈرسی نا"
اس نے کہا "ہاں ہاں۔ مجھے معلوم ہے"
"میں یہاں لایا گیا ہوں" میں نے کہا "تاکہ تم سے شادی کی درخواست کروں"
"واقعی" اس نے کہا۔
"جانتی ہو میں نے تمہیں کہاں دیکھا تھا؟ اوگوزوف میں بپتسمہ کے موقع پر" میں نے کہا اور اس نے جواب دیا۔
"ہاں۔ مجھے یاد آگیا۔ تم خیسل نوسے آئے ہونا؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

"بڑے اچھے مناظر ہیں وہاں"

"بس اس کی عقلمندی کے بارے میں ہی کہا جا سکتا ہے! اس کا باپ مجھ سے جلدی شادی کر لینے کے لئے کہتا رہا کیونکہ گھر کی نگرانی کرنے والی کے بغیر کوئی آدمی اچھی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا"

"ساتھ رہ کر ہماری زندگی زیادہ خوشگوار ہو سکتی ہے" اُس نے کئی مرتبہ کہا۔ ہم لوگ صبح تک یونہی ناچتے گاتے رہے"

"مقدس گیت؟"

"جی نہیں مختلف اقسام کی مناجاتیں اور گیت"

"اچھا۔ کیا تمہاری منسوبہ نے کوئی گیت گایا تھا"

"جی نہیں۔ البتہ بعد میں جب میں نے اُسے چھوڑ دیا —— تو —— آپ کو معلوم ہے نا —— وہ ایک گیت گاتی تھی —— جس میں ہے کہ —

اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا ہائے ہائے[1]
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

"آ۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم نے اس سے بیوفائی کی؟"

"معلوم نہیں۔ بہرحال میرے پاس تھا کیا جس پر شادی کرتا"

"ھُنُوں۔ تو اسکول جل کر خاک ہو گیا"

"جی ہاں۔ بالکل"

"تو کیا سارا سامان اور کتابیں بھی جل گئیں؟"

"نہیں۔ اُنھیں بچا لیا گیا۔ آگ دن میں لگی تھی اس لئے لوگوں کو کتابیں وغیرہ بچا لینے کا موقع مل گیا"

"یہ اچھا ہوا کیوں کہ میرے خیال میں لوگ مدرسہ پھر بنا لیں گے اور تم پھر پڑھانے پر نوکر ہو جاؤ گے"

"میں بیزار ہو چکا ہوں اس سے۔ آپ یقین نہ کریںگے۔ میرے دل میں کئی مرتبہ خودکشی کا خیال آ چکا ہے"

"تو پھر تم کلرک بننا پسند کرتے ہو؟"

"جی سرکار"

"ھُنُوں۔ مجھے افسوس ہے لیکن میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے حال ہی میں اپنے محرر کو برطرف کر دیا ہے لیکن مجھے دوسرے محرر کی ضرورت نہیں۔ دیکھو نا ہر چیز پر ذاتی نگرانی ہونی چاہیئے۔ میں اپنے حسابات خود ہی کرتا ہوں۔ میرے پاس فرق امین کی ایک جگہ خالی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں آپ تم پسند نہ کرو گے۔ تنخواہ بہت کم ہے ...... تین روبل ماہانہ"

"بہت کم ہے" مدرس نے کہا۔

"دیکھا نا! مجھے محرر کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اسکول ماسٹر بننا کیوں نہیں پسند کرتے!"

"میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا"

"اس میں شک نہیں کہ شجرِ علم کی جڑ نہایت کڑوی ہوتی ہے لیکن اس کے پھل بہت شیریں ہوتے ہیں ...... نہیں۔ نہیں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ تم عوام میں علم کی روشنی پھیلاؤ ...... آج کل جبکہ علم ضروریاتِ زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔ ہم سب کو انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کام میں مدد دیں" میں خود جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے کرنے کو تیار ہوں میں تمہارے مدرسہ کو اپنی کتابیں تحفتاً دونگا۔ ایلو شکا! اے ایلوشکا! ذرا وہ صندوق تو لانا۔ اُدھر کمرے میں صوفے کے نیچے رکھا ہوا ہے"

نوکر ایک صندوق لے کر آیا جسے چاروں طرف سے چوہے کتر چکے تھے۔

[1] شگفتہ۔

"یہ دیکھو" رئیس نے کہا "یہ کتاب تمہارے لئے ہے" "قدرت کا انتقام" بڑی عمدہ کتاب ہے۔ مجھے یاد نہیں کس مضمون پر اور یہ دیکھو" "قسم ... بھئی میرے خیال میں تو تم ساری کتابیں لے جاؤ۔ نیا اسکول بننے پر ساری کتابیں ایک سلسلے سے ترتیب دیکر کتاب خانے میں اس کتبہ کے ساتھ رکھنا" "یاکوف اینٹونووچ سوی زکوف کا تحفہ" جو پرورد گار کے زمیندار ہیں" مستقبل مجھے یاد رکھے گا .... مجھے بڑی مسرت ہے کہ قسمت تمہیں یہاں لے آئی ورنہ میری کتابیں بیکار پڑی رہتیں اب اُن سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ کئی نسلوں کو بھی ..... الیوشکا! اے الیوشکا! دیکھو گھوڑا تیار کرو اور آپ کو کتابوں کے ساتھ موضع بیزو بوف پہنچا دو"

دو مہینے میں نیا مدرسہ بن چکا تھا۔ تعلیمی کتاب خانے میں حسب ذیل قیمتی کتب کا اضافہ ہو گیا تھا جنھیں مسٹر سوی زکوف نے "تحفتاً عنایت فرمایا تھا"

"امرائے جہنم کی مراسلت"

"کتوں کے ذریعہ شکار"

"روسی تعیلمز"

"قدرت کا انتقام"

"بلگارین کی تصانیف"

"سیاسی اور اخلاقی کہانیاں"

"ماسکو گزٹ"

"ایک نئی لاطینی الف بے"

"دانائی سے متعلق طلبہ سے خطاب"

"رہنمائے اخلاق"

"حقیقی حکمت کے قواعد پر ایک مختصر رسالہ"

اَب کسی چیز کی ضرورت نہ تھی سوا ایک مدرس کے کہا جاتا ہے کہ سابق مدرس نے پھانسی لے کر خودکشی کر لی تھی۔

(نکولائی یونپسکی)

ثاقب کانپوری

جوانی

پیغام جنوں دیتے ہیں ہنستے ہوئے تارے	ہیں کتنے جوانی کے یہ دلچسپ نظارے
ہر صبح نظر آتا ہے فردوس کا منظر	بیٹھا ہوں لئے سینے میں جذبات کا محشر

انجام سے غافل ہوں میں انجام سے غافل

کس درجہ ہیں پُرکیف جوانی کے ترانے	سنتا ہوں میں تاروں سے محبت کے فسانے
ہیں چاند کے کس درجہ دل آویز اشارے	گویا کہ ہیں مسحور یہ دریا کے کنارے

اب مجھکو خبر کچھ نہیں آلامِ جہاں کی

معمور نظر آتی ہیں نزہت سے فضائیں	اک سکر سا برساتی ہیں گھنگھور گھٹائیں
ہر چیز میں نغمہ ہے ہر اک شئے پہ جوانی	کہتا ہے ہر اک ذرہ محبت کی کہانی

اک خواب سی ہے شورشِ ہنگامۂ ہستی

ندی کی روانی میں ہے اک کیف پرافشاں	ہر چیز سے ہے رنگ جوانی کا نمایاں
جو منظرِ ہستی ہے جوانی سے ہے سرشار	جو نقش نظر آتا ہے ہوتا ہے گہربار

اللہ رے جوانی کا یہ رنگِ طرب انگیز

شیر محمد اختر

نفسیاتِ زندگی کا ایک ورق

خوف

میں خوف ہوں، انسانیت کا دشمن؛
میں ایک ڈراوا ہوں جو زندگی کے راستہ پر گھات لگائے بیٹھا ہوں۔
مجھے آنکھیں نہیں دیکھ سکتی۔ میرا بسیرا ڈرپوک انسان کا دل ہے۔
میں یاس کا باپ ہوں، جہل وحجت میرے بھائی ہیں۔ مجھے ترقی سے بیر ہے۔ استبداد میرا ہتھیار ہے۔
میرا ان دیکھا وجود کتنا ہیبت ناک ہے۔ بن دیکھے اس کا رعب سب پر طاری رہتا ہے۔ جہالت نے مجھے جنم دیا ہے اور غلط خیالات کی گود میں میں نے پرورش پائی ہے۔
اُمید کو تاریک کر دکھانا میرا کام ہے۔ تمناؤں کو تشنہ رکھنا میرا شیوہ، میں نے کتنے آورش توڑ ڈالے۔ کتنی کامیابیوں کو پروان چڑھنے سے روکا۔
میں نے بڑے بڑے سورماؤں کو بزدل اور کاہل بنا دیا۔
میں نے بہادروں کے ہاتھوں سے تلواریں چھین کر انھیں ذلیل کرایا۔
کامیابی کی دہلیز پر بڑے بڑے سوداگر پہنچ کر لوٹ آئے۔ میں نے انسانیت کے ہزاروں اعلیٰ مقاصد ناکام کر دیئے۔
میں نت نئے روپ دھارن کرتا ہوں۔ احتیاط میرا ہی ایک روپ ہے۔ قدامت پسندی میرا دوسرا نام ہے۔
میرا نام خواہ کچھ رکھ لو۔ میرا کام ہمیشہ ترقی کی راہ میں روک ڈالنا ہے۔
اگر کوئی شخص میرا مقابلہ کرے تو میری غضب ناک آواز اُس کے کان بہرے کر دیتی ہے۔ میرا نعرہ "یہ تم سے ممکن ہی نہیں" اس کے بدن میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔

میرے زہر کا ایک ہی تریاق ہے ـــــ ادراک۔
اس کے سامنے میرا بس نہیں چلتا۔ اس کی روشنی کے سامنے میری تاریکی خودبخود ماند پڑ جاتی ہے۔ اس کے سامنے جب میں بولنے لگتا ہوں تو خود اپنا سایہ خوف بن کر مجھ پر طاری ہو جاتا ہے

میں کیا ہوں۔ محض انسانی ذہن کا ایک واہمہ۔
مجھ میں نہ کوئی طاقت ہے۔ نہ کرامات۔ میری ساری قوت تو خود اس انسان کی دی ہوئی ہے جس کے دل میں میرا بسیرا ہے۔
جوں جوں اس کے اندر سمجھ بوجھ کی روشنی آتی ہے، میں غائب ہونے لگتا ہوں۔
آخر میں کون ہوں؟
محض ایک خیالی تصویر!

عقیل احمد جعفری

آسمانی بچہ

کوئی مزدور مفلس تڑکے تڑکے — چلا جاتا تھا تنہا سر جھکائے

بلا کا جاڑا تھا، یا لاغضب کا — زمانہ کا بدن ٹھٹھرا ہوا تھا
اُٹھا سکتا نہ تھا کوئی کہیں سر — اُتر آیا تھا "شاہ یخ" زمیں پر
نہ اُڑتے تھے نہ ہلتے تھے، جمے تھے — پرندے پیڑ کا "پھل" بن گئے تھے
اماں کی جا نہ میدان تھا نہ جھاڑی — گلے کا ہار تھی قمری کے سردی
ہوئے تھے خشک سردی کے اثر سے — ٹپکتے تھے نہ آنسو چشمِ تر سے
سفیدی برف کی تھی پیرہن میں — کہ لیٹی تھی زمیں اُجلے کفن میں

کہ اس مزدور نے اک تارا دیکھا — فلک سے جو ابھی گویا گرا تھا
بڑھا یہ دیکھ کر آگے غریب اور — جو پہنچا بید مجنوں کے قریب اور
تو پائی برف پر اک شئے جھلکتی — سنہری کچھ زرد پیلی "گنگا جمنی"
ٹھٹک کر پہلے تو رک رک کے دیکھا — بالآخر اور بڑھ کر جھک کے دیکھا
چھوا ہاتھوں سے تو جنبش سی پائی — ٹٹولا پار چہ تو "جان" آئی
نہ سونا تھا نہ تارا تھا نہ دھوکا — یہ تھا زربفت میں انساں کا بچا

اندھیرا گھپ یہ جنگل کا یہ سردی — کوئی عورت ہی اس کو لائی ہوگی
جگر اپنے ہی ہاتھوں سے چھلا ہے — یہ ناجائز محبت کا صلا ہے

نہ منظر دیکھ پایا بیکسی کا — لے آیا اپنے گھر "تحفہ" کسی کا
"گنہ کی گٹھری" منزل دور کی اُف
عقیل انسانیت مزدور کی اُف

"راحیل"

بہکا بہکا تخیل

سوچ بچار کا مرض کتنا عجیب ہوتا ہے ایک لاعلاج ناسور۔ جس کا درماں افلاطون سے بھی نہ ہو سکے بوعلی سینا بھی عاجز رہجائے ——— !

زندگی مختلف وادیوں میں گھومتی ہوئی گمراہ ہوجاتی ہے۔ دماغ ایک آہوئے رَم خوردہ کی طرح بھٹکنے لگتا ہے۔ بعض وقت تو کچھ ایسی نامعلوم بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کے خیال کی ہوا بھی نارسا ہوجائے۔ یہ افسانوں سے بھری ہوئی زندگی، اسکے انوکھے پلاٹ، اس کا نرالا اسلوب، غرض میں کیا سمجھوں اِس کا مفہوم! کوئی سمجھ کر ہی کسی کو سمجھا سکتا ہے۔ میں ہی جب کسی چیز کو اچھی طرح نہ سمجھوں تو پھر کسی کو کیا سمجھاؤں۔ یہ دنیا جینے بھی تو نہیں دیتی۔ بس اتنا سمجھ میں آیا کہ ابتک کچھ بھی تو نہیں سمجھی۔ زندگی کے داؤ پیچ کچھ ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ اس کو بھلا کون سمجھے جتنی بھی ابتک سمجھ میں آئی ہے۔ اس کا سمجھنا نہیں آتا اس میں سمجھنے کی بہت سی باتیں ہیں۔ اس کو ہر پہلو سے دیکھنا اور پرکھنا ہے۔ اور میری اپنی خود زندگی اتنی مختصر و کم مایہ ہے کہ گردن موڑ کر کسی طرف دیکھ لینے کی بھی تو مہلت نہیں۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی ابتک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میری اِس واہی تواہی بکواس کا موضوع کیا ہے۔

چلتے چلتے زندگی میں ایک ایسی پرکیف ٹھوکر لگتی ہے، زندگی کی یکسانیت میں ایک ایسی خوشگواری ہلچل پیدا ہو جاتی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کب اور کیسے ہو گیا۔ ساری سوجھ بوجھ غارت ہو جاتی ہے عقل اپنا سا منہ لے کر رہجاتی ہے۔ دماغ اپنا توازن کھو دیتا ہے۔ یہ سب کیسے ہو جاتا ہے۔ نہیں معلوم! آس، نراس، بیچینیاں، اطمینان کی ایک ہلکی سی جنبش، انتظار، اس کا نتیجہ، ناکامی، ناامیدی، نامرادی ——— اور پھر قید کی تاریکیوں کی طرف ڈھکیل دینے والا صبر ——— ایک ایسا صبر جو پیہم مایوسیوں سے جبر کی صورت اختیار کر لے۔ ایک ایسی مایوسی جس کی اتھاہ گہرائیوں میں صرف موت ہی سے سکون ملے۔ ایک ایسا سکون جس کو ایک ابدی سکون کہہ سکتے ہیں۔

"دنیا بہ امید قائم" بھی کوئی ترکیب لفظی ہے؟ کتنی مہمل، کتنی بے جان بندش ——— کتنا سہانا سبز باغ، کتنی دھندلکوں میں گھری ہوئی سکاری کتنی سراب آسا پرکاری ——— ایک دھوکا، اور پھر رنگین دھوکا، ایک زبردست فریب، ایک حقیقت نما مجاز ——— پس وہ ——— کچھ اسی قسم کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی ——— ایک مسافر تھا جس کی منزل کھو گئی ہو ——— ایک بے مقصد زندگی اس کا ساتھ دیئے چلی جاتی تھی۔ نگاہ کی آرزو آموزی نظر کی سادہ پرکاری، ان سبکی حقیقت اس پر واضح ہو چکی تھی ——— اُس نے پاکر

خیالات تھے، لیکن اُن کے دہرانے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کو بے مقصد و بے لاگ جینے کے ڈھنگ آ چکے تھے —— وہ اس زندگی سے تھک چکی تھی، وہ سہانے سوتے جیسے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگ اٹھی تھی۔ اُس کے سپنے تھے ہی کتنے — سلونے، سہانے —— لیکن اب —— اُن کا بھی شیرازہ منتشر ہو چکا تھا ——

میں ایک خواب دیکھ رہی تھی ——

اس میں بس یہیں تک لکھا تھا کہ —— آنکھ کھل گئی —— شاید کسی افسانہ لکھنے کا خیال میرے لاشعوری دماغ میں گھوم رہا تھا —— لیکن اس کی تکمیل نہ ہو سکی —— اور اچھا ہی ہوا جو نہ ہو سکی —— آنکھ کھلنے کے بعد نہ جانے کیوں —— بہت دیر تک شیخ علی حزیں کا یہ شعر تخیل کی وادیوں سے ٹکرا رہا تھا ؎

اے وائے بر اسیری کز یاد رفتہ باشم
در دام ماندہ باشد، صیاد رفتہ باشد

اُف! یہ زندگی ایک ڈھونگ ہے اور بس ——!"

ضربیں

قیسی رام پوری

قیسی انسانی کمزوریوں پر اس قدر شدت سے انگلی رکھتے ہیں کہ ہر انسان اپنے ماؤف حصۂ جسم کو ٹٹولنے لگتا ہے اُن کا نظریۂ حیات ارفع و بلند ہے وہ یکتائے اسلوب ہیں قیسی کی تمام افسانے اور ناول زندہ رہنے والے ہیں (بقیہ)

وزیر زادہ طاہر عثمانی

تجلیات

مری رودادِ غم شاید کہیں دہرائی جاتی ہے
ستارے مرتعش ہیں، چاندنی تھرائی جاتی ہے

حقیقت زیست کی لفظوں میں کب سمجھائی جاتی ہے
اُلجھ جاتی ہے اتنی جس قدر سلجھائی جاتی ہے

کہاں ہے وہ مئے رنگیں ترے شیشوں میں اے ساقی
مرے خمخانۂ پندار میں جو پائی جاتی ہے

کلی جیسے چٹک جاتی ہے سورج کی شعاعوں سے
انھیں یوں دیکھ کر دل پر مسرت چھائی جاتی ہے

مرے زخمِ جگر کی ٹیس میں کب انقلاب آیا
جہاں یہ پائی جاتی تھی، وہیں پر پائی جاتی ہے

ہوا کرتی ہے قدرِ آدمی حسنِ تکلم سے
یہ وہ نایاب شے ہے جو بہت کم پائی جاتی ہے

زمانے میں ابھی کچھ دورِ رنگیں آنے والے ہیں
بشارت اُن کی میرے حال ہی سے پائی جاتی ہے

شمیمِ گل، بہارِ خلد اور سرمستیٔ عالم
تمہاری یاد میں شامِ تمنا پائی جاتی ہے

چمکتا ہے یہ اُن کا جلوۂ رنگیں نگاہوں میں
کہ اک برقِ مجسم سامنے لہرائی جاتی ہے

کبھی ایسی بھی ساعت قہر آتی ہے محبت میں
کہ اظہارِ تمنا میں بھی مشکل پائی جاتی ہے

قدوس صہبائی
بی۔اے۔آنرز

سانپ کا بدلہ

کمپنی باغ کے چوراہے پر ڈگڈگی بجانے کی آواز آئی۔ چند لڑکوں، بچوں اور دو چار شاگرد پیشہ ملازموں کا غول اس طرف دوڑا، لوگوں کے جمع ہو جانے پر مداری نے پٹارا کھولا اور کالا سانپ اپنا پھن اٹھا کر ناچنے لگا۔ تھوڑی دیر میں شاید سانپ اور نیولے کی لڑائی ہونے والی تھی۔ تماشائی منتظر تھے۔

باغ کے دوسری طرف ولایت سے نئے نئے درآمد کئے ہوئے گورے کلکٹر صاحب کی کوٹھی تھی۔ یہ آئی۔سی۔ایس صاحب ایسے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے جب انقلابی طاقتیں بڑے زور شور سے مصروف عمل تھیں اور صوبوں کی حکومت کی باگ ڈور کانگریسی جماعت کے قبضہ میں تھی — کلکٹر صاحب کو ہندوستان کی روانگی سے پہلے ان کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ چونکہ وہاں یہ ایک عام تبدیلی کا زمانہ ہے اس لئے ضلع کے ایک حاکم ہونے کی حیثیت سے اُن کا فرض یہ ہے کہ عوام سے اپنا رشتہ بہت مضبوط رکھیں۔

عوام سے اپنا رشتہ اور ربط قائم رکھنے کا نیک مشورہ کلکٹر صاحب نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس لئے وہ اکثر شام کو پیدل تفریح کرتے ہوئے کمپنی باغ کے آس پاس اور دار الحکومت کی ایسی سنسان سڑکوں پر پائے جاتے تھے جہاں امراء زیادہ اور غریب کم نظر آتے ہوں۔

اس وقت صاحب اپنے بنگلے سے نکل کر کمپنی باغ ہی سے سیدھے مجمع کی طرف آ رہے تھے ممکن ہے انہیں رابطۂ عوام کے مشورہ پر پہلی مرتبہ عمل کرنے کا موقع ہاتھ آیا ہو۔ مجمع نے انہیں پہچان لیا کسی نے فرشی سلام کیا، کسی نے راستہ دیا، صاحب بھی تماشہ دیکھنے لگے۔

مداری نے کافی انعام حاصل ہونے کی امید میں زیادہ دلچسپی اور جانفشانی سے کام شروع کر دیا۔ صاحب بڑے محظوظ ہوئے اور انہوں نے مداری سے پوچھا۔

"تم اپنا دوست سانپ کو کیسے سکتا ہے ——؟"

انہیں تعجب تو نہیں تھا لیکن وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کس طرح یہ لوگ اتنی خطرناک چیز پر قابو پا لیتے ہیں مداری نے جواب دیا۔

"حضور، ہم ان کے ساتھ محبت اور رحمدلی کا برتاؤ کرتے ہیں اور یہ سانپ ہمارے اس برتاؤ کو زندگی بھر نہیں بھولتے، مگر حضور، سانپ، سانپ ہی ہوتا ہے۔ ہم اپنے بچاؤ کے لئے اس کے منہ سے زہر دانی نکال دیتے ہیں۔"

"مگر سانپ والا تم اس کو پکڑتا کیسے ہے —— اور اور ......" صاحب صاف ہندوستانی نہ بول سکتے تھے انہیں اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں مشکل ہوئی شاید مداری ان کا مفہوم سمجھ گیا ہوگا۔ اس لئے اس نے جواب دیا۔

"حضور، یہ بڑا کٹھن کام ہے، اور یہ ذات کبھی اپنا بدلہ لینا نہیں بھولتی۔ اگر کسی سے سانپ کو ذرا سی

بھی تکلیف پہونچی ہو تو سانپ اُس سے بدلہ لئے بغیر نہ رہیگا اگر ہم سانپ کو کبھی کوئی تکلیف پہونچا دیں اور وہ ہمارے قبضہ میں آجائے تو ہمیں بڑی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ ——یوں بھی ایک ستائے ہوئے سانپ سے زیادہ کوئی چیز دُنیا کے پردہ پر خطرناک نہیں۔

صاحب کو مداری کی بات کا یقین نہ آیا اُنھوں نے کہا: "تم جھوٹ بولتا ہے" لیکن بازیگر اپنے فن کی آسانی سے ایسی توہین ہوتی ہوئی برداشت نہ کرسکتا تھا فوراً بولا:

"سانپ بھی آدمی کی طرح سمجھ رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ کب کیا کرنا چاہیئے۔ ایک مرتبہ کوئی اسے چھیڑدے پتھر ماردے تو وہ اس بات کو سالہا سال تک یاد رکھتا ہے اور بدلہ کا موقع ڈھونڈھتا ہے چاہے اِس کوشش میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے"

کلکٹر صاحب نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی تماشہ کو چھوڑکر وہ "واک" کے لئے چل پڑے البتہ اپنے دِل میں اُنھوں نے یہ ضرور سوچا کہ اگر ایک سانپ کا دماغ اور عقل بھی اِنسان کی طرح ہوتی تو مداری کا کہنا ممکن ہوسکتا لیکن اُس نے جو کچھ کہا ہے یہ ممکن ہی نہیں۔

شام کو دیر میں وہ کوٹھی پر واپس آئے اور دوسرے دن مداری اور سانپ کے متعلق اُنہیں خیال بھی رہا۔ اِتفاق سے کوٹھی کے احاطہ میں بہت بڑا باغ لگا تھا۔ درختوں کی کثرت اور بارش کے موسم کی وجہ سے اس زمانہ میں اکثر سانپ نِکل آتے تھے اور صاحب کو بھی یہ بات معلوم تھی۔

ایک دن شام کی تفریح کے بعد جب صاحب واپس ہوئے تو اُنھوں نے کتّے کے بھونکنے کی آواز سُنی، اور وہ اس کی طرف چلے۔ موٹر گیرج کے قریب پہونچکر کیا دیکھتے ہیں کہ کتّے کی کمر سے ایک خوفناک سانپ لپٹا ہوا ہے، سانپ اِنتہائی غیظ وغضب کے عالم میں ہے اور کتا بے بس ہوجانے کو ہے۔ اُنھوں نے یہ سوچا کہ اگر ذرا توقف سے کام لیا تو کتے کا کام تمام ہوجائے گا۔ اِس لئے ایک بڑا سا پتھر اُٹھایا اور کتے کی طرف چلے۔ سانپ نے یہ احساس کرکے کوئی دوسرا دُشمن بھی موجود ہے کتے کو چھوڑ دیا اور پھن اُٹھا کر کلکٹر صاحب کو دیکھنے لگا۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں انسانی آنکھوں سے ملیں اور ایک لمحہ میں کلکٹر صاحب کے ہاتھ سے پتھر چھوٹ کر سانپ کی کمر پہ جا پڑا سانپ اپنی جگہ سے ذرا آگے بڑھا اور پھر اس نے دشمن سے نگاہ ملائی اور اس وقت صاحب بہادر کی آنکھ جھپک گئی۔ اُنھیں یہ محسوس ہوا کہ سانپ کی نگاہوں سے دھواں نکل رہا ہے اگرچہ اُن کی نگاہ صرف ایک لمحہ کے لئے ان ہیبتناک نگاہوں سے ملی تھی لیکن اِن نظروں میں غصّے اور بدلے کے جذبات نمایاں تھے۔ وہ خوف سے کانپ گئے لیکن اپنے حواس مجتمع کرکے اُنھوں نے دوسرا پتھر اُٹھایا اور سانپ پر پھینک مارا، پتھر خالی گیا اور سانپ راستہ کاٹ کر گھاس میں جا چھپا۔

یہ واقعہ بھی جیسے جیسے دن گزرتے گئے کلکٹر صاحب کے دماغ سے فراموش ہوگیا——۔

پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک دن دوپہر کو کلکٹر صاحب برآمدہ میں بیٹھے اَبرآلود فضا اور ٹھنڈی ہوا سے لُطف اندوز ہورہے تھے۔ "لنچ" کھا چکے تھے۔ اور آرام کرسی پر سگار کے دھوئیں سے مشغل فرما رہے تھے۔ ہوا کی خوشگواری اور غذا کی آسودگی نے نیند کو دعوت دی، پہلے غنودگی طاری ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ سوگئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بیدار ہوئے لیکن ابھی اچھی طرح ہوشیار نہ ہونے پائے تھے کہ اپنے کھلے گریبان میں سے قمیص کے اندر اُنھوں نے کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی اور لجلجی سی جاندار چیز داخل ہوتی ہوئی محسوس کی اور آنکھیں کھولدیں—— معاذ اللہ! نظروں نے ایسا منظر دیکھا جس سے

ان کا رواں رواں تھرا اٹھا، زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا وہ لرزہ براندام ہوگئے ـــ کالا سانپ ان کی برہنہ جلد پر قمیص کے نیچے چل رہا تھا۔

ناامیدی کی نازک گھڑی میں حفاظت جان کی خاطر فطری خوف نے صاحب بہادر کو "ہرچہ بادا باد" پر آمادہ کردیا انھوں نے اس جرأت کے ساتھ جو ناامیدی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ موذی سانپ کے پھن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اور حسن اتفاق سے وہ کامیاب بھی ہوگئے۔ سانپ کا پھن ان کی مضبوط گرفت میں تھا ـــ

غصے سے دیوانہ ہوکر سانپ نے اپنی دم سے متعدد چوٹیں جو تازیانہ کی ضرب سے کہیں شدید تھیں کلکٹر صاحب کے جسم پر لگائیں اب صاحب، سانپ کا سرد جسم اپنے سینہ اور کمر کے گرد لپٹا ہوا محسوس کر رہے تھے ایک ہاتھ سے وہ سانپ کے بل نکالنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسرا ہاتھ مضبوطی سے اس کا منہ پکڑے ہوئے تھا۔ سانپ موقع موقع سے اپنی دم کا استعمال برابر کر رہا تھا۔ اور یہ جدوجہد زیادہ خوفناک ہوتی جارہی تھی ـــ صاحب کی سانس پیٹ میں نہ سماتی تھی، وہ اپنے حلقے مضبوط کرچکا تھا اور سختی سے ان کی ہڈیاں دبا رہا تھا جس کی تکلیف کا احساس یہ تھا کہ گویا شکنجہ میں جکڑ دیا گیا ہے، وہ کرسی سے نیچے گر پڑے تھے اور اب انھوں نے چلانا بھی شروع کردیا تھا۔ نوکر چاکر آس پاس کھڑے ہوئے سوچ رہے تھے کہ رہائی کی کیا تدبیر اختیار کریں

صاحب کی میم صاحب بھی ایک پستول لئے بازو میں کھڑی تھیں اور ارادہ کر رہی تھیں کہ سانپ کو گولی ماردیں لیکن سانپ کے حلقے جو کلکٹر صاحب کے گرد لپٹے ہوئے تھے اور اس کا منہ جو صاحب کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا انھیں اس کا موقع نہ دیتا تھا۔ سانپ اور انسان دونوں خوف جان اور غیر معمولی کشمکش کی وجہ سے پورے برآمدہ کے فرش پر لوٹ رہے تھے۔ رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ـــ اس سنسنی خیز اور خطرناک جنگ کے یہ پانچ منٹ دیکھنے والوں کیلئے گھنٹوں سے زیادہ تھے دونوں حریف اپنی پوری طاقت ایک دوسرے کو زیر کرلینے کے لئے صرف کر رہے تھے اور دونوں کو یہ احساس تھا کہ کامیابی ایک آخری کوشش کی محتاج ہے۔ دونوں جانب سے تازہ حملہ شروع ہوا اور سرکتے سرکتے صاحب بہادر اور انکے ساتھ سانپ برآمدہ سے پانچ نیچے فرش پر جا پڑے۔

لوگ جو بیوقوفوں کی طرح برآمدہ میں سے تماشہ دیکھ رہے تھے یہ دیکھکر احساس خوف سے چلا اٹھے کہ سانپ نے انسان سے آزادی حاصل کرلی ہے اور جلد ہی وہ اپنا خونناک بدلہ لینے والا ہے ـــ بدلہ کی اسپرٹ میں سانپ کا پھن ابھر چکا تھا، بس ایک لمحہ! اور دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے کلکٹر صاحب کا کام تمام تھا۔ میم صاحب ایک چیخ مار کر بیہوش ہوگئیں ـــ عین اس وقت ایک چھوٹا سا بھورا جانور جو اب تک خاموشی سے کسی گوشہ میں بیٹھا اس لڑائی کی نگرانی کر رہا تھا اچانک بجلی کیطرح جھپٹا اور سانپ کی گردن دبا بیٹھا۔ سانپ نے خود کو اپنے زیادہ خونخوار دشمن نیولے کی گرفت میں کچھ اس طرح پایا کہ اسپر قابو پالینا اس سے مقابلہ کرنا ناممکن ہوگیا۔ نیولے کو فتحیابی میں کوئی زیادہ وقت پیش نہ آئی ـــ میم کو ہوش میں لایا گیا جنھوں نے نیولے اور سانپ کی لڑائی دیکھی ـــ ان کے شوہر کا موذی دشمن مغلوب و مفتوح ہوچکا تھا۔

نیولا اس بہادرانہ جنگ سے فارغ ہوکر چند لمحے حاضرین کے سامنے ٹھیرا گویا کلکٹر صاحب کی جان بخشی اور اپنی فتح پر داد طلب کرے ـــ لیکن میم صاحب جو شکرگزاری کے طور پر اپنے شوہر کے جان بخش محسن کو دودھ پلا کر معاوضہ دینا چاہتی تھیں بڑی مایوس ہوئیں کیونکہ وہ جب آگے بڑھیں تو نیولے نے بغرور احسان مندی کا یہ حقیر سا معاوضہ لینا اپنی توہین سمجھی شاید وہ آزادی کو عیش کی غلامی پر ترجیح دیتا تھا ـــ اسی لئے بھاگ کر قریب کی جھاڑی میں غائب ہوگیا۔ لیکن یہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ حادثہ تصور کیا جائے لیکن کلکٹر صاحب کے اس تجربے نے یقین کی اور یقین نے مذہبی عقیدت کی صورت اختیار کرلی تھی کہ سانپ کا بدلہ انتہائی خوفناک اور بالکل یقینی ہوتا ہے۔"

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

بہشتِ ہند

دیارِ ہند جانِ ایشیا ہے
بڑی نعمت ہیں اس کے کوہ و دریا
ہمالہ سب سے اونچا برف کا گھر
ہر اک وادی ہے جنت کا نمونہ
گھنے جنگل ہیں اونچی چوٹیوں پر
یہ گنگا جان ہے اس سرزمیں کی
وہ مستانہ ادائیں گومتی کی
نوا پیرا ادھر راوی کی موجیں
ادھر ستلج رواں ہے پیچ کھاتا

یہیں ہر ذرہ اس کا دیوتا ہے
نہایت جانفزا آب و ہوا ہے
فضائے آسماں پر چھا رہا ہے
ہر اک دریا کا منظر غم ربا ہے
بشر جن سے ابھی نا آشنا ہے
یہ جمنا اس چمن کی دلربا ہے
کہ شیخ خشک بھی جن پر فدا ہے
ادھر گوداوری نغمہ سرا ہے
ادھر جویا کسی کا نربدا ہے

یہ کشور ہے تماشاؤں کا مسکن
پہاڑوں اور دریاؤں کا مسکن

جہاں میں بے نظیر اپنا وطن ہے
تسلط اک طرف کوہِ گراں کا
پہاڑوں کی سہانی وادیوں میں
ہمیشہ چیت کا موسم ہے گویا
فلک تاریک ساون کی گھٹا سے
یہی گھر ہے بہارِ جاوداں کا
ادھر صبحِ بنارس کی تجلی
فضائیں بانسری کی لے میں گم ہیں
لگے ہیں سیم و زر کے ڈھیر ہر سو

جہاں جنت بھی گم ہو وہ چمن ہے
سمندر تین جانب موجزن ہے
ہجوم لالہ و سرو و سمن ہے
ہوا مشکیں، زمیں گل پیرہن ہے
چمن میں چھپ کے کوئل نعرہ زن ہے
غزل خواں بلبلِ شیریں سخن ہے
ادھر شامِ اودھ کا بانکپن ہے
بہشتِ رنگ و بو گوکل کا بن ہے
مثالِ کیمیا خاکِ دکن ہے

یہیں ہے فارغ البالی کا مسکن
مسرت اور خوش حالی کا مسکن

تمکین کاظمی

بھول

(زبیدہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے گراموفون بج رہا ہے کسی مشہور گانے والے کا ریکارڈ ہے۔ کسی کے تیز تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے اور ماما آکر زبیدہ سے کہتی ہے)

ماما: "بیوی! ڈاکیئے نے یہ چٹھیاں اور کتابیں دی ہیں۔"

(اخباروں اور رسالوں کے پیکٹ میز پر رکھنے کی آواز)

زبیدہ: "(لفافہ پھاڑ کر چٹھی نکالنے کی آواز) کریمن! گاڑی منگواؤ میں اماں جان کے ہاں جاؤں گی۔"

کریمن: "بیوی! ابھی تو سرکار نہیں آئے، آپ چائے پی کر جائیں گی نا؟"

زبیدہ: "چائے وائے میں نہیں پیوں گی سرکار آتے رہیں گے میں ابھی جاؤں گی جلدی گاڑی لاؤ۔"

(کریمن جاتی ہے، قدموں کی چاپ)

زبیدہ: "(اپنے آپ گفتگو کرنے لگتی ہے) بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ناز دنیا زہیں میں تو اس کو اپنی بہن ہی سمجھتی تھی اللہ رے قطامہ بڑی ہی کائیاں نکلی، بہن سے محبت جتا کر بہنوئی کو لگا رکھا ہے، بھلا اب دنیا میں کوئی کس کا اعتبار کرے بہن اور پھر بہن کی سوت اللہ کی قدرت ہے۔"

کریمن: "بیوی گاڑی آگئی۔"

(کریمن واپس جاتی ہے اور ایڑی دار بوٹ کی چاپ سنائی دیتی ہے۔)

سلطان: "(کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ہنستے ہوئے پوچھتا ہے) یہ گاڑی کیوں کھڑی ہے کیا کہیں جا رہی ہو؟"

زبیدہ: "ہاں، میں جا رہی ہوں۔"

سلطان: "کہاں؟"

زبیدہ: "جہاں سینگ سمائیں، ملکِ خدا تنگ نیست۔"

سلطان: "اچھا، تو گویا سرکار خفا ہیں۔"

زبیدہ: "جی اور خوش ہوں گی آپ نے کام ہی تو ایسا کیا ہے۔"

سلطان: "میں نے کیا کیا؟"

زبیدہ: "اللہ اللہ، بیچارے کچھ جانتے ہی نہیں، کتنے بھولے ہیں۔"

سلطان: "صاف صاف کہو۔"

زبیدہ: "صاف صاف کہوں، پوچھتے ہوئے لاج نہیں آتی۔"

سلطان: "لاج کیسی؟"

زبیدہ: "اللہ رے بے حیائی! اُف رے بے غیرتی پوچھتے ہیں لاج کیسی؟ خداوندا تو نے کیسے کیسے بے شرم پیدا کئے ہیں۔"

سلطان: "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کہتی کچھ نہیں ہو شرم و لاج گنائے جا رہی ہو!"

زبیدہ: "اجی آج تمہاری چوری پکڑی گئی ہے، تم تو کہتے تھے پرانے قصے بھول جا، آئندہ کے لئے میں نے

توبہ کرلی ہے!

سلطان: ذرا صاف صاف کہو میری سمجھ میں نہیں آیا!

زبیدہ: آپ کی سمجھ میں کیوں آنے لگا۔ ابھی اُڑیں گے آپ!۔

سلطان: شاید کسی نے مذاق میں تم سے کچھ کہا ہے اور تم بگڑ رہی ہو!

زبیدہ: جی ہاں مذاق ہی مذاق میں آپ کی چہیتی کی چھٹی میں نے پالی ہے، سمجھے آپ؟ آپ کی عاشقی کا حال کھل گیا، سُنا آپ نے!

سلطان: واللہ تم تو پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟

زبیدہ: جی پہیلیاں نہیں بجھوا رہی ہوں حقیقت حال بتا رہی ہوں چھٹی مجھے مل گئی ہے!

سلطان: میری سمجھ میں نہیں آتا! کس کی چھٹی کیسی چھٹی؟ کیا میری چھٹی ہے؟

زبیدہ: آپ کی چھٹی مجھے کیسے ملتی آپ تو بڑی احتیاط سے بھیجتے ہوں گے البتہ آپ کی راحت جان کی چھٹی میں نے پالی ہے۔

سلطان: میری چھٹی؟ میری لکھی ہوئی؟ حیرت ہے!

زبیدہ: کہہ تو رہی ہوں کہ آپ کی چھٹی مجھے نہیں ملی بلکہ آپ کی ایک محبوبہ کی چھٹی ملی ہے آپ ہیں کہ بوکھلا رہے ہیں!

سلطان: میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا؟ کس کی لکھی ہوئی چھٹی ہے؟ نام تو بتاؤ!

زبیدہ: معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بہت سی رانڈوں کو گھیر رکھا ہے اور کئی ایک سے خط و کتابت ہے اسی لئے کسی ایک کا نام سمجھ میں نہیں آتا!

سلطان: دیوانی عورت! ذرا تفصیل تو سُنا!

زبیدہ: ہوشیار مرد! لے یہ تیری اس محبوبہ کا خط ہے جو چھٹی لکھ کر میرے ہی نام کے لفافے میں تیرے لئے بھی تسکین دل کا نسخہ رکھ دیتی ہے!

(زبیدہ میز پر سے ایک لفافہ اٹھا کر سلطان کو دیتی ہے)

سلطان: (لفافہ لیکر مسکراتے ہوئے) لاحول ولا یہ تو بشیر النساء کا خط ہے!

زبیدہ: دیکھا آخر خط پہچان لیا نا؟

سلطان: اری دیوانی! بشیر النساء کو تو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں آخر وہ تمہاری ہی تو عزیزہ ہے، بھلا میں اس کی نسبت بُرا خیال کروں گا؟

زبیدہ: جی نہیں! آپ بُرا خیال کیوں کرنے لگے، صرف عاشقی کر رہے ہیں!

سلطان: توبہ کرو زبیدہ!

زبیدہ: توبہ ہے توبہ ایسے نیک شوہر سے!

سلطان: یہ خط تمہیں کب ملا؟

زبیدہ: ابھی ابھی ½ ۲ بجے کی ڈاک سے یہ خط آیا ہے، نیک بخت نے مجھے خط لکھا ہے اور ایک چھٹی اپنے پیارے کے نام بھی ملفوف کر دی ہے اور کس محبت سے مجھے لکھا ہے کہ ملفوفہ چھٹی دولہا بھائی کو ضرور دے دینا اللہ رے ڈھٹائی۔

سلطان: (لفافے میں سے کاغذ نکال کر پڑھتا اور ہکلاتے ہوئے کچھ کہنے لگتا ہے) ....

زبیدہ: (سلطان کے ہاتھ سے چھٹی لے کر با آواز بلند پڑھنے لگتی ہے)

میرے پیارے!

کل تمہارا کوئی خط نہیں آیا آج کی ڈاک بھی خالی گئی ایسے کیا مصروف ہو کہ بشیر کو تم نے بھلا دیا، کل اگر پھر مجھے کوئی خط نہیں ملا، پرسوں میں خود تمہارے پاس پہونچ جاؤں گی اور یاد رکھو ایسی سخت سزا دوں گی کہ گذشتہ سزاؤں کو بھول جاؤ گے فقط صرف تمہاری

بشیر النساء

(زبیدہ خط کی عبارت ختم کرنے کے بعد
ہچکیاں لے کر رونے لگتی ہے اور روتے
ہوئے کہتی ہے)

زبیدہ: تو اب بھی کوئی بہانہ تراش لو! اس سے پہلے بھی
دو تین چٹھیاں میرے نام کے خط میں بشیر نے تمہارے
لئے بھجوائی تھیں وہ چٹھیاں میں نے تمہیں دیدیں
نہ جانے اُن میں کیا تھا۔ آج اتفاقاً میری نظر پڑ گئی
تو یہ قصہ معلوم ہوا۔ نہ جانے تم کب سے اس طرح عاشقی
کر رہے ہو؟ بہن، بہن کی سوت بن رہی ہے اُف
ری عورت!

سلطان: زبیدہ! یقیناً غلط فہمی ہو رہی ہے غالباً بشیر النساء
نے اپنے شوہر کے نام چٹھی لکھ کر تمہارے خط میں
غلطی سے رکھدی ہے۔

زبیدہ: (بات کاٹ کر) ہاں ضرور غلطی ہوئی کیونکہ میرے
نام کے لفافے میں چٹھی رکھدی ہے ورنہ تمہارے
نام الگ لفافہ آتا!

سلطان: زبیدہ! بشیر بڑی شریف لڑکی ہے تم خواہ مخواہ
اس سے بدگمان ہو رہی ہو!

(زبیدہ چیخ چیخ کر رونے اور بسورنے
لگتی ہے)۔

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے
ماما تیز آتی ہے)

ماما: سرکار! بشیر بیگم کے دولہا میاں آئے ہیں!

سلطان: بلالو!

(زبیدہ میز پر سے لفافہ اٹھا کر چھپا لیتی
اور آنسو پونچھنے لگتی ہے اور بشیر النساء
کا شوہر داخل ہوتا ہے)

زبیدہ: (بھرائی ہوئی آواز میں) دولہا بھائی! آپ
کب آئے؟

بشیر کا شوہر: ابھی تو آرہا ہوں! (سلطان سے مخاطب ہو کر)
بھائی سلطان! بشیر کا کوئی خط تو نہیں آیا؟

سلطان: (پریشان ہو کر زبیدہ کی طرف دیکھتا ہے اور
زبیدہ غصے سے سلطان کی طرف گھورنے لگتی
ہے سلطان پریشان ہو کر جواب دیتا ہے)۔
کیوں بھائی! کس لئے پوچھ رہے ہو آج ہی ایک
خط زبیدہ کے نام آیا ہے!

بشیر کا شوہر: جی زبیدہ کے خط سے غرض نہیں آپ کے
نام بشیر کا کوئی خط آیا ہو تو کہئے!

سلطان: (مردہ آواز میں) زبیدہ کے خط میں ایک چٹھی
اور تھی مگر شاید وہ میرے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔

بشیر کا شوہر: وہ چٹھی مجھے دیدیجئے!

سلطان: کیوں؟

بشیر کا شوہر: مجھے ضرورت ہے!

زبیدہ: (مارے غصے کے سانس پھول جاتا ہے اور
آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلتی نظر آتی ہیں
کپکپاتی آواز میں کہتی ہے) چٹھی دیدو نا!

بشیر کا شوہر: (زبیدہ کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے) واللہ
بڑا پر لطف نظارہ ہے اسی نظارے کی خاطر
میں اپنا کام خراب کر کے آیا ہوں!

زبیدہ: آپ کو اس چٹھی کا حال معلوم ہے؟

بشیر کا شوہر: ہاں مجھے معلوم ہے اور یہ بھی کہہ سکتا ہوں
کہ اس کا مضمون کیا ہے یہ چٹھی میرے پیارے
سے شروع ہو کر صرف تمہاری پر ختم ہوتی ہے۔

زبیدہ: اُف ری بے حیائی! دنیا سے شرم
اٹھ گئی ہے۔

بشیر کا شوہر: (ہنستے ہوئے جیب میں سے ایک لفافہ
نکال کر زبیدہ کو دیتا ہے) یہ خط تو پڑھو!

زبیدہ: یہ تو بشیر کا خط ہے آپ کے نام!

بشیر کا شوہر: ہاں لفافہ تو میرے ہی نام ہے خط تو
پڑھو!

(زبیدہ لفافے میں سے خط نکال کر پڑھتی ہے اور مسکراتے ہوئے لفافہ بشیر کے شوہر کو واپس کر دیتی ہے سلطان اس کی طرف حیرت سے دیکھتا ہے، بشیر کا شوہر لفافے میں سے خط نکال کر آواز سے پڑھتا ہے)

سلطان بھائی

آج جنوری کی گیارہ تاریخ ہے مگر آپ نے اب تک اِس مہینے کے نئے رسالے نہیں بھیجے، "ادبی دنیا" "نگار" اور "پیامِ ادب" ضرور بھجوائیے۔ فقط

خادمہ بشیر النساء

بشیر کا شوہر: آج صبح مجھے خط لفافہ جو چاک کرتا ہوں تو اندر سلطان بھائی کے نام کی چٹھی تھی میں نے سمجھ لیا کہ غلطی سے میرے نام کی چٹھی سلطان کو بھیجی گئی ہے میں دعا کر رہا تھا کہ خدا کرے کسی طرح یہ چٹھی زبیدہ کی نظر سے گزرے اور دونوں کی کشمکش میرے سامنے ہو شکر ہے کہ میں وقت پر پہونچ گیا۔

(تینوں مِل کر قہقہہ لگاتے ہیں، زبیدہ ما کو آواز دے کر چائے منگواتی ہے)

طبعزاد۔

جمیلہ!

ادیب مالیگانوی

اَب وہ ساقی ہے نہ وہ مئے نہ وہ پیمانۂ عشق
کس کے جاتے ہی گئی رونقِ میخانۂ عشق

شعلۂ حسن سے بزمِ محبت نہ رہا
کون دیکھے تپش اندوزیٔ پروانۂ عشق

کوئی مضراب زنِ سازِ تمنا ہی نہیں
ورنہ ہے برق اثر نغمۂ مستانۂ عشق

اُن کے دم تک تھا حقیقت ہی حقیقت ہمدم
اب تو افسانہ ہی افسانہ ہے افسانۂ عشق

ذرے ذرے میں نظر آتا تھا اک شہرِ جنوں
کبھی آباد وسا آباد تھا ویرانۂ عشق

جب کوئی وقف تھا آرائشِ محفل کے لئے
تھا مرا خانۂ برباد، پریخانۂ عشق

حسن کو شوق، کہ ہوں صرفِ ادب اندازِ جمال
عشق کو لاگ کہ ہو جان بھی نذرانۂ عشق

وہ تھے یا دولتِ کونین، یسر تھی مجھے
وہ شب ماہ، وہ تنہائی وہ کاشانۂ عشق

حسن کے سازنے کچھ سوز جو دے رکھا تھا
ناز کرتا تھا اسی سوز پہ پروانۂ عشق

کیسے اس ساعتِ زریں کو فراموش کروں
حسن پہ عشق فدا، حسن تھا دیوانۂ عشق

آج بھی میں ہوں جمیلہ کا پرستار ادیب
آج بھی ہے وہی مسجودِ صنم خانۂ عشق

ہلال احمد

فردیّت

فلسفۂ فردیت
کا اصل اصول یہ ہے کہ ریاست پر لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو فرد کے ذاتی معاملات میں کم سے کم دخل اندازی کرے۔

اُنیسویں صدی میں یوروپ میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ حکومت کے اختیارات حد سے متجاوز ہیں۔ لہذا یہ اختیارات حکومت سے چھین کر فرد کی تحویل میں دیدیئے جانا چاہئیں۔ اِس انحراف کے اسباب اقتصادی اور معاشی تھے۔ نئے ممالک کی دریافت اور مشین کی ایجاد نے لوگوں پر تجارت کی نفع بخشی کا راز فاش کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تجارت حکومت کے اثر سے قطعی آزاد ہو۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک ہمہ گیر ہو گئی۔

فردیت کو بعض پائے کے مفکروں نے موضوعِ فکر بنایا ہے۔ مثلاً جرمن فلاسفر کانٹ اور انگریز علماء جان اسٹوارٹ مِل اور اسپنسر اُن کا کہنا ہے کہ ریاست کا وجود فرد کی خوشحالی اور مسرت کے لئے ہونا چاہیئے اور یہ مسرت صرف اسی صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے جبکہ ریاست فرد کے ذاتی معاملات سے سروکار نہ رکھے۔

حامیانِ فردیت کی رائے میں ریاست کو اپنے وظائف بہت محدود کر لینا چاہئیں۔ اُسے صرف قیامِ امن اور ملکی دفاع تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھکر بقیہ اُمور فرد پر چھوڑ دینا چاہئیں۔ فرانسیسی مفکر جلیس سائمن کے نزدیک ریاست کو جامد —— —— بن جانا چاہیئے۔ فری مین —— —— .... اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ "ریاست کا وجود اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِنسان کی اِنسانیت تشنۂ تکمیل ہے"۔

فردیت کے وکلاء عام طور پر چار قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں:-

(۱) انصاف کا تقاضہ ہے کہ اپنی شخصیت کو بنانے بگاڑنے کا فرد کو کامل اختیار رہو۔ قدرت نے ہر جاندار کو بعض خصائص ودیعت کئے ہیں جن کے تحت وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اگر ریاست کی جانب سے اس پر پابندیاں نہ ہوں تو وہ صلاحیت کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھال لے گا۔ تعلیم و تربیت کے اُمور میں دخل اندازی کر کے ریاست فرد پر سخت ظلم کرتی ہے۔ ریاست کے احکام کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ تمام افراد ایک ہی سانچے میں ڈھل جائیں۔ یہ نہ صرف فرد بلکہ پورے سماج کی بہبود کو غارت کرنے کے مرادف ہے۔

مِل اپنی کتاب "آزادی" میں لکھتا ہے کہ بدترین اخلاق سوز رائے کے اظہار پر بھی بندش نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس طرح نیکی کے محاسن زیادہ روشن ہو جائینگے۔

مگر افعال کے بارے میں مِل کی رائے مختلف ہے۔ افعال کے وہ دو حصے کرتا ہے:-

(۱) وہ افعال جن کا اثر محض فرد کی ذات تک محدود رہے۔ جیسے لباس کھانا پینا وغیرہ۔

(۲) وہ افعال جن سے کرنے والے کے علاوہ

دوسرے افراد بھی اثر پذیر ہوں جیسے ننگا رہنا وغیرہ۔ ایسی مذموم حرکتیں ان کی رائے میں قابلِ مواخذہ ہیں لیکن ان کے دوسرے ہم مسلک اس باب میں خاموش ہیں۔

(۲) بہت سے حامیانِ فردیت اپنے استدلال کو طبیعیات سے جا لگراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طاقتور کا کمزور کو ہڑپ کر جانا اور اس طرح اپنی بقا کے لئے جد و جہد کرنا قدرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک طرف نوی جاندار بھوکوں مر جائیں گے۔ دوسری طرف نیم جان کیڑے کوڑوں کی بہتات ہو جائے گی۔ اسپنسر جو خود طبیعیات کا ایک متین طالبِ علم تھا اسی استدلال کا سہارا لیتا ہے۔ وہ ریاست کی اس حکمت عملی کی کڑی نکتہ چینی کرتا ہے کہ وہ قوانین کے ہیر پھیر سے سب افراد کے لئے ترقی کا ایک ہی معیار مقرر کرتی ہے۔ نتیجۃً وہ افراد جن میں ترقی کی صلاحیت جنم سے مفقود ہو جیسے تیسے جیتے رہتے ہیں اور اپنے وجود سے معاشرے کے تعفن میں اضافہ کرتے ہیں۔

اسپنسر امدادِ غربا سے متعلق قانون سازی کا بھی سخت مخالف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسے قوانین نافذ کر کے ریاست ایک انتہائی نوعیت کے جرم کا ارتکاب کرتی ہے لوگوں کو مفت خوری کی عادت ڈلواتی ہے۔ ان کی آگے بڑھنے کی صلاحیت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ جد و جہد سے عاری اپاہج بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے نزدیک یہ فعل نظامِ فطرت میں دست اندازی ہے۔ اس کی کتاب "سماجی عدریات" ایسے بیانات سے بھری پڑی ہے۔ وہ بار بار فرد کو ریاست سے قطع تعلق کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

(۳) متذکرہ بالا دونوں دلائل انیسویں صدی کے حامیانِ فردیت کی طرف سے پیش کئے جاتے تھے۔ جدید فردیت کے وکلا اپنی منطق کو ایک نیا لباس پہناتے ہیں۔ ایسے ہی ایک انگریز صاحبِ علم نارمن انجل ہیں۔ انھوں نے اپنے طویل مقالے "عظیم غلط نگاہی" میں فردیت کو معاشیات کے نقطۂ نظر سے اجالا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا زمانہ وہ تھا جبکہ پہلی جنگِ عالمگیر ہنوز ختم ہی ہوئی تھی۔ دنیا جنگ کے ہولناک عواقب سے دوچار ہو رہی تھی۔ بیکاری اور سیاسی و اقتصادی بحران کا دور دورہ تھا۔ وہ فردیت کا جواز یہ کہکر ثابت کرتے ہیں "انسان کی تمام تر دوڑ دھوپ کی اساس اقتصادی ہے۔ معاشی مفادات کا باہمی تضاد و تخالف لڑائی بھڑائی کی جڑ ہے۔ فطرتاً آدمی اسی کام کو لگن سے کرتا ہے جس سے اسے زیادہ سے زیادہ مالی فائدے کی امید ہو۔ موجودہ زمانے میں آپس کی رقابت کے باعث حکومتیں کچھ اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتی ہیں کہ افراد نفع بخش اشیا کا انتخاب صحیح طور پر نہیں کر پاتے۔ اگر ریاست کو نشر و اشاعت کے حق سے محروم کر دیا جائے تو جھگڑے ٹنٹے آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گے۔

اس نقطۂ نگاہ کے حامیوں کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ افراد کو صنعت و حرفت کے میدان میں خود مختاری عطا کرنے سے ریاست فائدے ہی میں رہے گی نقصان میں نہیں۔ کیونکہ آخر ریاست کا مفاد افراد کے اجتماعی مفاد کے سوا کیا ہے؟

(۴) چوتھی اور آخری دلیل فردیت کے حامیوں کی یہ ہے کہ ریاست کو غلط کاریوں سے پاک سمجھ بیٹھنا بھاری غلطی ہے۔ برخلاف اس کے حقیقت یہ ہے کہ ریاست کا شاید ہی کوئی فعل ایسا ہو جو صحیح وقت اور درست طریق پر انجام دیا جاتا ہو۔ ریاست کے کرتا دھرتا کون ہوتے ہیں؟ افسران و حکام۔ یہ لوگ ہمیشہ اخراجات میں بے جا سخاوت کرتے ہیں کیونکہ ان کو پبلک کے روپے کا درد نہیں ہوتا وہ جانتے ہیں کہ اس میں اگر ان کا کوئی حصہ ہے بھی تو آٹے میں نمک سے بھی کم۔ فرد خرچ کرے گا تو آگا پیچھا سوچ کر کرے گا۔ وجہ یہ کہ یہ اس کے اپنے مستقبل کا سوال ہوگا۔ اسے احساس ہوگا کہ ذرا سی بھول چوک اسے خطرات میں

مبتلا کر سکتی ہے۔

فردیت کے مخالفین اِس کی کاٹ کرتے ہوئے جو مختلف نوعیتوں کے اعتراضات کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) فردیت اِنسان کو اِنسان نہ سمجھ کر فرشتے کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ اس پر غور نہیں کرتی کہ کمزوری اِنسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ فردیوں نے بلا سوچے سمجھے یہ فرض کر رکھا ہے کہ تمام افراد میں دور اندیشی اور غور و فکر کا مادہ برابر برابر ہے، ہر شخص کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے ذرائع پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ فرد کی فلاح ساری ملت کی فلاح کے متوازی جاتی ہے۔

(۲) فردیت کے حامی آزادی کا جو مفہوم لیتے ہیں وہ مبہم اور غیر واضح ہے۔ ہر قسم کے بندھنوں کو توڑ دینا آزادی نہیں بے راہ روی ہے۔ مثلاً اگر فرد کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دیدی جائے اور وہ بلا جھجک بیچ بازار میں رفع حاجت کرنے بیٹھ جائے تو ریاست تو باز پرس کرنے سے رہی لیکن اس کے پڑوسیوں کو اس کی اِس خدمت کے کارن جس تکلیف کا سامنا ہوگا وہ ظاہر ہے۔

(۳) ریاست کو یکسر اغلاط کی پوٹ سمجھ لینا اور یہ خیال کرنا کہ اس کے افعال فرد کے مفاد کے منافی ہوتے ہیں معقولیت سے بعید ہے امر واقعہ یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں ریاست فرد کے نجی معاملات میں دست اندازی کر کے اس پر بڑا اِحسان کرتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی وجہ سے اپنے بچے کو اسکول نہیں بھیجنا چاہتا ریاست حکماً اسے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ صریحاً والدین کی آزادی میں مداخلت کرنا ہے۔ مگر یہ بھی تو سوچئے کہ اس ذہنی مداخلت نے نہ صرف بچے کی زندگی سدھار دی بلکہ ماں باپ کے اِطمینانِ قلب کا سامان بھی کر دیا۔ اشیاء کے محض سلبی پہلو پر نگاہ رکھنا اور ایجابی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دینا غلطی ہے۔

(۴) اِنسان معاشری جاندار ہے۔ افراد کے معاملات باہم اِس درجہ مربوط ہیں کہ اُن کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا تارک الدنیا فقیر بھی زندگی کی گرم بازاری سے منہ موڑ لینے کے باوجود دنیا سے سو فیصدی تعلق نہیں توڑ سکتا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک آدمی آنکھیں موندے ناک کی سیدھ چلا جاتا ہو اور دوسرے راہ گیروں سے اسکی ٹکر نہ ہو؟

(۵) اِسپنسر نے وارڈن کے نظریۂ اِرتقاء کے زیرِ اثر یہ رائے قائم کی کہ سبھی لوگوں کے لئے ترقی کی ایک راہ تجویز کرنا قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ جس طرح شیر جنگل کے چھوٹے موٹے جانوروں کا شکار کر کے زندہ رہتا ہے اسی طرح اِرتقاء کے عمل میں کمزور اِنسان بھی مرکھپ جاتے ہیں یا کم از کم مرکھپ جانا چاہیئے اور اِس طرح قوی اِنسانوں کے لئے راستہ صاف ہو جانا چاہیئے۔ نیز یہ کہ دکھی غریبوں کی مدد کر کے ریاست ان کی جبلی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے سے روک دیتی ہے۔

منطق کے لحاظ سے کسی دلیل کا اندازہ ہونا دوسری بات ہے مگر اسپنسر کی اِس رنگ آمیزی سے فردیت کا اخلاقی پہلو بہت مکروہ ہو گیا۔ اور لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سماج ماہیت کے اعتبار سے ایک اِنسانی اِدارہ ہے۔ اُس کے قواعد کی تدوین میں حیوانی دنیا کے اُصولوں کی ٹھونس ٹھانس ناقابلِ برداشت ہے۔

(۶) تاریخی تجربے کے پیشِ نظر بھی فردیت کو قابلِ عمل قرار دینا دشوار ہے۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں جنتا کی روش سے مرعوب ہو کر بہت سی یورپی حکومتیں افراد کے ذاتی قضیوں میں پاؤں اڑانے سے کترانے لگی تھیں۔ چنانچہ انگلستان میں یہ کیفیت ہوئی کہ کارخانہ دار مزدوروں سے بے حد کام لیتے تھے وہ بے چارے زیادہ اُجرت کے لالچ میں دن رات

بنتے رہتے تھے نتیجۃً قومی صحت کا ادارہ گھٹنے اور پریشانیاں بڑھنے لگیں پریشانیوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا بات بگڑتی دیکھ کر حکومت نے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی ترک کر دی۔

مندرجۂ بالا سطور کو پڑھنے کے بعد ایک غیر جانبدار شخص یہ رائے قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فردِ انسان کی حسِ فارغ البالی اور بے فکری کا خواب۔ وہ اپنی جگہ احسن ہے لیکن اس کے لئے جو وسائل اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہے وہ نا مکمل بلکہ غیر دانشمندانہ اور تباہی کی طرف لیجانے والے ہیں۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کے معاملات میں دوسرے لوگ مخل نہ ہوں مگر ساتھ ہی یہ کون چاہتا ہے کہ وہ ذمہ داریاں بھی اکیلے اسی کے سر پر آ پڑیں جو سدا سے مشترکہ طور پر سارا سماج سنبھالتا آیا ہے؟

سید ضمیر جعفری

اپنے گاؤں کی یاد میں

وہ دلہن کی طرح نکھرے ہوئے شاداب ویرانے
وہ یکسر اک ہجوم انجم و مہتاب ویرانے
لرزتی، گنگناتی مستیاں سنسان راہوں میں
دئیوں کے مضمحل شعلے مقدس خانقاہوں میں
وہ اک روحانیت تالاب کے ٹوٹے کناروں پر
وہ اک شاداب سی مستی، سہانے سبزہ زاروں پر
ہوا میں پھیلتی موسیقیاں، ساکت اندھیروں میں
فضا میں جاگتی رعنائیاں روشن سویروں میں
لبِ جہلم پہ کچھ معصوم سی آبادیاں ہر سو
(طلسمی وادیوں میں خواب کی شہزادیاں ہر سو)
ہجوم لالہ و گل، زرفشاں زرکار وادی میں
طلائی گھاٹیاں، وہ ریشمیں اشجار وادی میں
نظر کی وسعتوں میں پھیلتے گلزار دہقانوں کے
وہ کچھ بے ربط نا ہم سلسلے کچے مکانوں کے
رسیلی بانسری کی جوڑیاں، شیشم کے "دوتارے"
چراگاہوں میں الھڑ راگ کے بہتے ہوئے دھارے
لبِ دریا — گھڑوں کے ساز — دوشیزاؤں کے نغمے
کنواری بیٹیوں کے ساتھ سادہ ماؤں کے نغمے
طلسم انگیز شامیں، وہ بھرے ساون کی برساتیں
وہ خود رو جھاڑیوں کی اوٹ میں رنگیں ملاقاتیں
کشادہ — گرد میں ڈوبے ہوئے ماتھے کسانوں کے
سنہری مچھلیوں والے بھرے بازو جوانوں کے
سہانی — سانس لیتی چاندنی میں رات کا منظر
کھری چاندی کے سوتے جاگتے ذرات کا منظر!
گزی گاڑھے کے کرتے، چھینٹ کی خود رنگ شلواریں
وہ لمبے دامنوں پر سوت کی کاڑھی ہوئی تاریں
مقدس، آسمانی سادگی، ڈھیلے لبادوں میں
نگاہوں میں حیا، پاکیزگی مبہم ارادوں میں

مرے مغموم دل کا غنچۂ افسردہ کھل جائے
مجھے اے کاش! پھر وہ جنتِ گم کردہ مل جائے۔

ہماری ۱۹۴۳ء کی ہر دلعزیز مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	روپیہ	آنہ	پائی
۱	اَدب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین رائپوری	۳	۸	۰
۲	گرداب	احمد ندیم قاسمی	۳	۱۲	۰
۳	لہریں	ڈاکٹر شفیق الرحمان	۳	۱۲	۰
۴	اَفسانے اور ڈرامے	سعادت حسن منٹو	۲	۱۲	۰
۵	زندگی کے نئے زاویے	رئیس احمد جعفری	۳	۰	۰
۶	مضامین عبدالماجد دریابادی		۴	۴	۰
۷	محمد علی	مولانا عبدالماجد دریابادی	۲	۱۲	۰
۸	مردوں کی مسیحائی	"	۴	۴	۰
۹	یقین و عمل	عبدالقدوس ہاشمی	۲	۸	۰
۱۰	مقالات محمد علی	مرتبہ رئیس احمد جعفری	۳	۱۲	۰
۱۱	مقالات محمد علی حصہ دوم	"	۳	۱۲	۰
۱۲	رنگ محل	ساغر نظامی	۳	۱۲	۰
۱۳	نغمات ماہر	ماہر القادری	۳	۰	۰
۱۴	محسوسات ماہر	"	۳	۰	۰
۱۵	ٹیگور اور اُن کی شاعری	مخدوم محی الدین	۱	۸	۰
۱۶	کاروان علم	فیض محمد و بادشاہ حسین	۳	۰	۰
۱۷	اِقبال کا تصور زمان و مکان	ڈاکٹر رضی الدین	۰	۱۲	۰
۱۸	سیاست جاپان	علی امام بلگرامی	۰	۱۰	۰
۱۹	اِقبال کے خطوط جناح کے نام		۰	۵	۰
۲۰	ابن خلدون کے سیاسی و معاشرتی نظریئے	پروفیسر عبدالقادر	۰	۶	۰
۲۱	جمہوریہ چین	میر عابد علی خاں	۱	۱۲	۰

اِدارۂ اشاعت اُردو

عابد روڈ حیدرآباد (دکن)

سرور احمد
بی۔ اے

سِرِّ دلبراں

اُن پرسکون اور شیریں لمحوں کی یاد آج بھی اتنی تازہ ہے جتنی اس رات تھی جبکہ چودہویں کا ماہتاب ڈرائنگ روم کی چھوٹی سی کھڑکی میں اپنی بے شمار آنکھوں سے پیکرِ تبسم نسیمہ سے چشمک زنی میں مصروف تھا۔ اور میں خود فراموشی کے عالم میں فضائی کیفیات سے ناآشنا ذرا بھی اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ یہ سحر طرازی میرے معصوم قلب کو کسی بے پایاں سمندر کے گہرے بھنور کی طرف غیر محسوس طور پر کھینچے لئے جا رہی ہے۔ زمانہ نے جس تیزی سے کروٹ بدلی اس کو میں نہ اس وقت سمجھ سکا اور نہ آج۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ میں ایسے تیز دھارے میں بہتا چلا جا رہا تھا جہاں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ آخرکار وہ وقت بھی آگیا کہ میں نے نیم مدہوشانہ کیفیت میں اس بھنور میں کئی چکر کھائے اور گرداب کے ہیبتناک شور و شغب میں ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس عالم میں پہنچ گیا جہاں ہر شے شباب کی رنگینیوں سے لبریز تھی۔ اور ہزاروں نرم و نازک مجسمے مسرت و انبساط کا سرچشمہ بنے ہوئے صرف ایک ہی رشتہ محبت میں منسلک نظر آتے تھے وہاں دوئی کا نام نہ تھا۔ ان کا مقصدِ حیات ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ آستانہ محبت پر نذرِ عقیدت چڑھاتے رہیں۔ وہ اس فرض کی ادائی میں جس جوشِ عقیدت کے ساتھ ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے شگفتہ چہروں سے نمودار تھا۔

ہنوز میری نگاہیں اُن کیف پرور نظاروں سے سیر نہ ہوئی تھیں کہ میری زندگی کے رنگین باب میں تمناؤں، آرزوؤں۔ اور بے پایاں جذبوں کا قافلہ داخل ہوا میں یہ محسوس کرنے لگا کہ نیچر مجھے دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ ہر شے میں شگفتگی اور لطافت دکھائی دیتی تھی۔ اور اس سے جس انس کا اظہار ہوتا تھا وہ خاردار جھاڑیوں اور خشک نہروں میں اس سے پہلے کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔

میری طرح نسیم کے جذبات بھی روز افزوں تھے میں اپنے دل ہی دل میں داد دیتا تھا۔ اور خاموشی سے ہجر کی گھڑیوں کو پیامِ عشق لکھ لکھ کر کاٹتا۔ ہزاروں مرتبہ لکھا اور چاک کیا۔ دل کی رام کہانی صاف صاف لکھ دینا چاہتا تھا لیکن جب لکھنے بیٹھتا تو سوائے نسیمہ کے اور کچھ یاد نہ آتا۔ اس عالم میں نسیمہ ہی نسیمہ مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ اگر کچھ احساس تھا تو صرف اتنا کہ ایک پیاری موہنی صورت رہ رہ کر سامنے آتی ہے اور آناً فاناً غایب ہو جاتی ہے۔ محبت کے افسانہ کی تکمیل کے لئے دونوں محبت کے مارے ہوئے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے ان کی مثال ان دو چھوٹے بچوں کی سی تھی جو تنگ و تاریک کمرہ میں نتیجہ پر غور کئے بغیر گھس جانے کی کوشش کرتے ہیں اور آخرکار مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار رہجاتے ہیں

"رنج" اور "خوشی" دو توام بہنیں ہیں جن کی کمر جڑی ہوئی ہے یہ اپنے رقص میں انسان کو محو کر دیتی ہیں ان دونوں کے ناچتے وقت جب خوشی کا جگمگاتا رُخ سامنے آتا ہے تو انسان اس کے نظارہ کی روح پرور

کیفیتوں میں کھونے لگتا ہے عین اُس وقت " رنج" بجائے خوشی کے اپنا بھیانک چہرہ پیش کر دیتا ہے۔ اور اس طرح انسان کی ساری خوشیوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ میں نسیمہ کو دیکھتا اور خوش ہوتا تھا لیکن یہ خوشی زیادہ عرصہ تک رہنے والی نہ تھی۔ محبت کے جواب میں محبت —— یہی اس کشمکش کا ماحصل ہے لیکن نسیمہ کی بے اعتنائی نے آخر کار راز افشا کر دیا کہ جو آتش اس کے قلب میں فروزاں ہے اس کا لگانے والا کوئی اور ہی خوش نصیب ہے۔ اس کی گریہ و زاری اور شب و روز کی بیقراری میرے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہے۔

آہ۔ اس انکشاف نے جذبات میں شدید ہیجان پیدا کر دیا اور غیرت و حرمان کے ملے جلے احساس نے بری طرح اکسایا کہ اس روحانی صدمہ کا انتقام لیا جائے مگر کس سے۔ اور کس کے مقابلہ میں جس سے میں کل تک محبت کرتا تھا۔ اس سے ؟ پھر وہ محبت جو ازلی ہے۔ اور جو اَب بھی کسی نہ کسی انداز میں میری ہستی کو اپنی زبردست گرفت سے آزاد کرنے کے لئے تیار نہیں ! ایسے انقلابی دور میں جبکہ میزانِ حیات کا پلہ کسی ایک طرف جھک جانے کے خطرہ سے دوچار ہو رہا ہو اور انسان کی بہترین خصوصیات کے خلاف قوی تر امور کی کارفرمائی کے اندیشے لاحق ہوں تو آسان راہ یہی ہے کہ انسان اعلیٰ مثال قایم کرے۔ محبت سے انتقام' محبت کے مقابلہ میں' میری ہی قربانی ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے میں اپنے آپ کو آمادہ پاتا ہوں۔ پیاری نسیمہ' وسیم کی پجارن ہے۔ وہ میرا گہرا دوست اور بچپن کا یار ہے۔ نسیمہ کی خاطر اب میں اس سے اور زیادہ لگاؤ محسوس کر رہا ہوں۔

نسیمہ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ " خاتون" ہے اس کے احساسات پاک اور نازک ہیں اور خیالات اعلیٰ۔ وہ اپنا حق سمجھتی ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ چاہا جائے اور اس فرض کی ادائی کے لئے اس نے وسیم کا انتخاب کیا ہے۔ وسیم قبول صورت اور بے باک نوجوان ہے۔ بعض اوقات اس کی گفتگو سے بدذوقی کا اظہار ہوتا ہے تاہم اس کی دوسری خصوصیات کے مقابلہ میں اس کمزوری کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ سنجیدہ زندگی کے خشک اثرات کو مرغوب بنانے کے لئے نسیمہ نے اس شگفتہ لیکن تیز رنگ کا انتخاب کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ محبت پر تاریخی یا منطقی حیثیت سے نظر نہیں ڈالی جا سکتی۔ جو قوتیں اس عالم میں کارفرما ہوتی ہیں ان کو صرف وہی جان سکتا ہے جس کو ان سے دوچار ہونے کا موقع حاصل ہوا ہو۔ یہ ان واقعات میں سے ایک ہے جن کو معرضِ بحث میں نہیں لایا جا سکتا۔ وسیم' نسیمہ کا انتخاب ہے ؛ اس کی خوشی ہے' اور اس کے دل کا سکون ہے۔ نسیمہ کو وسیم کی آغوش مبارک !

نسیمہ میرا احترام کرتی ہے۔ اور جب کبھی محبت بھری نظر سے میری طرف دیکھتی ہے تو اس کی پرنم آنکھوں سے اس مجبوری کا انکشاف ہوتا ہے جس کا وہ شکار بنی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسیمہ دل کے ہاتھوں بک چکی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کی خوشی میں برابر کا شریک ہوں۔ اس کی ہر مسکراہٹ میری زندگی کا سہارا اور میرے اُجڑے ہوئے دل کی رونق ہے۔ میں آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ چودھویں کے چاند کی تاروں بھری رات میں۔

غزل

اُمید رضوی

وجہ سکونِ قلب ہو شورشِ اضطرار کیا
آپ کا منتظر جو ہو آئے اسے قرار کیا!

کارگہِ حیات میں جبر کا آئینہ ہیں ہم
زندگی بس میں جب نہیں موت پہ اختیار کیا

جس میں ہو ہوش بیکسیٔ عشق وہ خام ہو ابھی
کاہشِ جانگداز کیوں شورشِ اضطرار کیا

جاگنے والے ہجر کے ختم بھی کر یہ داستان
موت کا انتظار کر اس کا ہو انتظار کیا

آئینگے آپ آئینگے آپ ضرور آئیں گے
آپ کا وعدہ سچ مگر آپ کا اعتبار کیا

بخشنے والے درد کے مجھے دردِ مستقل
سوزِ دوام چاہیئے عارضی اضطرار کیا

آپ ہیں میری زندگی آپ ہیں وجہ زندگی
آپ کو بھول کر میری زیست کا اعتبار کیا

جھوٹی تسلیاں بھی کیا ہونگی سکون کا سبب
آپ ہی دل میں سوچئے آئیگا یوں قرار کیا

حسن پہ اعتماد بھی عشق کی ہیں ہلاکتیں
حسن خود اک فریب ہے حسن کا اعتبار کیا

آپ کے وعدے ہیں لیکن وجہ سکون غلط غلط
دل کی لگی بجھا سکے آتشِ انتظار کیا

چاندنی رات تاج[1] کی آج بھی ہے نگاہ میں
آتا ہو اس فضا میں پھر اب بھی کوئی نگار کیا

---

[1] تلمیح

ہماری نئی کتابیں

ضربیں۔ قیسی رامپوری — سے
زلزلے۔ قدوس صہبائی — عال/۱۲ر
انگڑائیاں۔ احمد ندیم قاسمی — سے/۴ر
سیلاب۔ " " — سے/۸ر
کردار۔ ماہر القادری — عار/۴ر
زندگی کی ٹھوکریں۔ جعفری — سے/۴ر
تعدیریں۔ منظور بخاری — عہ
پریم پجارن۔ قدوس صہبائی — ۱۲ر
مردِ انقلاب۔ " " — ۱۲ر
شادی اور محبت۔ مقصود فرحت — ۱۲ر
بخارا کا جمہوری انقلاب۔ — ۹ر
ترکستانی خاتون شاہراہِ انقلاب پر۔ — ۹ر
خدا اور کائنات۔ ماہر القادری — ۹ر
سیاروں پر زندگی کے امکانات — ۹ر

ادارۂ اشاعت اُردو

(عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن)

منظور سنجاری

آرام

محنت کے بغیر کہیں آرام نہیں، یہ بات زبان زدِ عام ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی محنت ہی کئے جائے اور اتنی محنت کرے کہ آرام کا حظ اُٹھانے کے قابل ہی نہ رہے، آدمی کبھی منازلِ ترقی طے نہیں کر سکتا اگر اُس کی زندگی صرف مشقت ہی مشقت ہے، بعض آدمی کام میں بہت زیادہ منہمک ہو جاتے ہیں، اور یہ انہماک اضمحلال پیدا کرتا ہے جس سے انسان کسی تفریح سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا مصروفیت کے باعث دماغ بیکار ہو جاتا ہے جس سے آزاد خیالی کم ہو جاتی ہے انسان کی طبیعت کا رُجحان صرف ایک ہی طرف ہوتا ہے اسے اگر آرام بھی ملتا ہے تو بے سُود۔ موم بتی کی طرح دن اُس کے سامنے پگھلتے رہتے ہیں۔

کام جب ذلیل محنت چاہے تو کبھی نفع بخش نہیں ہوتا، کیونکہ ذلت کبھی اخلاقی بلندی پیدا نہیں کرتی اس لئے کہ اس کا میلان ہمیشہ پستی کی طرف ہوتا ہے۔

کام انسانیت کا نہ منتہائے مقصود ہے اور نہ انجام اگرچہ یہ حاصلِ دُنیا نہیں مگر پھر بھی دنیاوی نعمتوں سے بلند و بالا ہے۔

قوتِ لایموت کے حصول کے لئے مصروف رہتے ہوئے آزاد رہنا بھی بڑی چیز ہے کام کرنا ذلت نہیں ہے مگر یہ سفلہ پن ہے کہ انسان ایک روپیہ کمائے اور ہر روزانہ خرچ کر کے اس خیال سے بیکار بیٹھا رہے تاآنکہ روپیہ ختم ہو جائے۔

بالزاک کہتا ہے کہ اگر سوسائٹی کے میدانوں سے

ہم نے لاکھوں من خوشی اکٹھی بھی کر لی پھر بھی اختتام ماہ پر یہ ہمارے قرضے کی اَدائیگی نہیں کر سکتی اس لئے محنت کرو محنت کرو۔ دماغی عرق ریزی سے ہمیں اپنی کھیتی کو پانی دیتے رہنا چاہیئے۔

اگرچہ بعض اوقات تونگری اخلاق کو تباہ اور دل کو پتھر بنا دیتی ہے مگر مفلسی بھی روحانیت اور حرارت کو فنا کر دیتی ہے، انسان کے بستر پر کانٹے بکھیر کر اس کے لئے دیانتدار معزز اور نیک بخت بننا ناممکن کر دیتی ہے اس لئے خیر الامور اوسطہا پر ہمیشہ عمل کرنا چاہیئے۔

کام اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنا معزز اور سُود مند نہیں جتنا کہ وہ بلند عزائم، اصلاحِ خیال، نشو و نمائے ادراک اور مناسب تفریحات زندگی کے لئے ہے یہ واقعہ ہے کہ دنیائے اَدب و سائینس کے بعض بہترین کام ایسے آدمیوں کے ہاتھوں سرانجام پائے جو اپنے کاروباری مشاغل میں مصروف تھے، انتہائی مجبوریوں میں کام کی زیادتی زندگی کی لطافتوں کو فنا کر دیتی ہے۔

لارڈ بیکن نے کہا ہے کہ "دانا کو کسی نہ کسی تمنا میں بے قرار رہنا چاہیئے" اس میں کوئی کلام نہیں کہ سب سے زیادہ باعمل اور مصروف آدمی جو ہوا ہے۔ یا ہو سکتا ہے اُس کے پاس بہت سا وقت تفریح کے لئے ہوتا ہے، درآں حالیکہ وہ کاروباری مدوجزر اور انقلاب کے دَور میں ہوتا ہے۔ سوائے اُس شخص کے

جو کاہل اور نا قابل ہو، یا نا اہلیت اور غلط خواہشات کی بنا پر ان کاموں کو ہاتھ میں لے جو دوسرے لوگ اس کی نسبت بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہوں یہاں بہت بڑا اختلافی نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ہمیں بہ یک وقت صرف ایک ہی کام بہ حسن و خوبی انجام دینا چاہیئے اور بقایا سے عدم توجہی اختیار کرتے ہوئے انحراف کرنا چاہیئے، یہ آسائش حاصل کرنے اور زندگی کی بہار و برکت کو محفوظ کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہے، اس سے فرصتی لمحات کا لطف حاصل ہوگا اور طبیعت کے پوشیدہ جوہر کھلیں گے، جس سے مسرتوں کے چشمے جاری ہو کر گوناگوں تفریح بخشیں گے تا آنکہ زندگی ایک دائمی آسائش بن جائیگی.

دُنیا میں تفریح حاصل کرنے کے بہت سے نیک اور منفعت بخش طریقے ہیں قدرت اپنی دائمی خوبصورتی کو بے نقاب کئے ہوئے ہے ہم اُس کے گوناگوں نظاروں کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کی وسعت لامحدود کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے رازوں کا جگر چاک کر سکتے ہیں، نباتات، جمادات، حیوانات، اور علمی دنیا کی بے انتہا تحقیقات انسان کے لئے ایک وسیع میدان پیش کرتی ہے، جس سے انسانیت کی قدیم و موجودہ تاریخ، تعلیم، حکومت اور دنیاوی تہذیب و ترقی کے بہترین ذرایع پر روشنی پڑتی ہے نہ صرف یہ بلکہ اُن میں ادب، سوانحعمری، شعر و شاعری اور افسانہ نگاری کا بے انتہا ذخیرہ تکمیل ذوق کے لئے موجود ہے۔

اٹلی کے سب سے بڑے مصور اور اس ملک کے سب سے بڑے شاعر نے آپس میں اپنے پیشوں کا تبادلہ کر لیا تھا، میچل رینگلو نے مصوری چھوڑ کر شاعری شروع کر دی اور ڈانٹے نے شاعری ترک کر کے مصوری اختیار کر لی، یہ اُن کی دماغی عیاشی کا دور تھا. لینارڈو اور میچل رینگلو عالمگیر شہرت کے مصور تھے جن کو مصوری کے علاوہ سنگتراشی معماری اور فن انجینئری میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔

روزیٹی بھی مصوری میں اتنا ہی باکمال تھا جیسا کہ شاعری میں؛

بعض دماغی کام کرنیوالے جسمانی ورزش کے شوقین بھی ہوتے ہیں وہ ہرن کا شکار گوشت و پوست کے لئے نہیں بلکہ اس دوڑ دھوپ سے ورزشی مفاد حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔

مسٹر ایشورتھ تشنن کے مریض تھے اگرچہ شکار کے شیدائی نہ تھے مگر پھر بھی کہا کرتے تھے کہ جنگلوں میں شکار کھیلتے رہنے سے اُن کی زندگی بچ گئی۔

خاں اصغر حسین خاں نظیرؔ لودھیانوی

ہمارا وطن

ستاروں سے اونچا ہمارا وطن ہے　　بہاروں کا ماویٰ ہمارا وطن ہے
بہشتِ تمناء ہمارا وطن ہے　　جہاں سے نرالا ہمارا وطن ہے
محبت کی دنیا ہمارا وطن ہے　　محبت سراپا ہمارا وطن ہے
جہاں بھر کا داتا ہمارا وطن ہے
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

وہ سب سے انوکھا وہ سب سے نرالا　　وہ آغوش میں جس نے شاہوں کو پالا
وہ ظلمت سے جس نے بشر کو نکالا　　وہ جس سے ہے سارے جہاں میں اجالا
وہ آفاق میں جس کا ہے بول بالا　　وہ پربت کا پیارا وہ جانِ ہمالہ!!
وہ گنگا سے محبوب دریاؤں والا
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

تجلّی سے ہر دشت مانندِ ایمن　　پہاڑوں کے اشجار پھولوں سے روشن
بہاروں کا گھر بلبلوں کا نشیمن　　محبت کا مامن مسرت کا گلشن
الم سوز ساون طرب خیز پھاگن　　ہمالہ کی وادی ہے گنگا کا دامن
ہے گوداوری کا کرشنا کا سنگن
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

گلستانِ آفاق بے رنگ و بو تھا　　فلاطوں کا حکمت کدہ بے نمو تھا
جہالت کا بت مصر کے روبرو تھا　　تہ آسماں روم بے آبرو تھا
جب انسان ناواقفِ گفتگو تھا　　بہت تنگ جب دامنِ آرزو تھا
یہاں علم اُس وقت بھی چار سُو تھا
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

ابو نذیر رحمانی

ایک خط

اِک آرزوئے محبت کا خواب دیکھا تھا
اَب اُس کی یاد بھی دِل سے بُھلا رہا ہوں میں

بجمہ عزیزم ——— خوش رہو!
اور کہو کیا حال ہے، تم نے تو اب خط لکھنے سے توبہ ہی کرلی اچھا کیا، لیکن یہ ایک ذریعہ تھا تمہاری خیر و عافیت معلوم ہونے کا، سو جاتا رہا۔

ہاں خیریت اور صرف خیریت! اور میں اس سے زیادہ چاہتا ہی کیا تھا اور اگر چاہتا بھی تو ہوتا کیا؟ انسان تو بہت کچھ چاہتا ہے لیکن حاصل ہو جب نا! اور ہونا بھی یہی چاہیئے، ورنہ دنیا والوں کی اگر ہر تمنا پوری ہونے لگے تو بس پھر چل چکی یہ دنیا کی گاڑی! تم ہی سوچو! تم نے شہاب کو کس بری طرح چاہا، پھر ہوا کچھ حاصل؟ یورپ جاکر ڈاکٹری پڑھنا چاہی، پھر جا سکیں؟ سچ بتانا! مجھے خط لکھنے کا کئی بار ارادہ کیا، پھر ہوا پورا؟ بھلا غور کرو، جب انسان کی بے بسی و مجبوری کا یہ عالم ہو تو پھر تم ہی بتاؤ کہ دنیائے خیالی کی تعبیر سے حاصل ———؟ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ کہہ یہ رہا تھا کہ تم نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ اور غالباً اس لئے کہ میں نے تمہیں انگاروں سے کھیلنے کو منع کیا تھا تم نے شاید برا مانا اور اس درجہ اثر لیا کہ اپنی خیریت سے بھی محروم کر دیا، جو میرا سرمایۂ حیات ہے اور اسے تم صرف اس لئے چھیننا چاہتی ہو کہ میں نے تم کو تمہاری ایک غلطی پر ٹوکا ایک ایسے جال سے نکالنے کی کوشش کی جس میں پھنسکر تم زندگی بھر پھڑ پھڑاتیں۔ خیر۔ تم نے جو فیصلہ کیا خوب کیا۔ کاش میں جانتا ہوتا کہ میری ہلکی سی نکتہ چینی بھی تمہاری طبع نازک پر گراں گزر سکتی ہے ———!

دیکھو! ایک معصوم بچہ رنگین تتلی کو دیکھکر خوش ہوتا ہے اسے پکڑنے کے لئے مچلتا ہے اور جب اس کے پیچھے دوڑتا ہے تو وہ اپنی طاقتِ پرواز کو ہوا دیتی ہے تیز اڑتی ہے اور بہت تیز۔ نادان بچہ آنکھیں اوپر اٹھائے بے تحاشہ، اندھا دھند دوڑتا ہے، اور جب ٹھوکر لگتی ہے تو گرتا ہے، تتلی ہاتھ نہیں آتی تو روتا ہے! چیختا ہے [illegible] تا ہے، مگر کب؟ اس وقت جب کمان سے تیر نکل چکا ہوتا ہے یہی اور بالکل یہی صورت تمہاری تھی، تم نے سمندر کی صاف و شفاف سطح کو دیکھا، خوب اچھی طرح دیکھا، پھر اس کے کنارے کنارے، اُجلے اُجلے، ٹھنڈے ٹھنڈے، چاندی سے پانی میں چاندی سے پاؤں اُتار دیئے اور جب آگے جانے کا قصد کیا تو رشتۂ روحی نے مجھے چونکایا اور میں نے تم کو سوچے سمجھے بغیر وہ سب کچھ لکھ دیا جس کی تاب تم نہیں لاسکیں خفا ہو گئیں۔ جو تمہاری بلند نظری اور فراخ حوصلگی کا عکس ہے اور بس ——— !سچ بتانا، پیشانی پہ کتنے بل آئے؟ ——— ؟ خفگی اور تلخی کے اتنے شدید

جذبات پیسکر بھی کوئی زندگی شروع کرتا ہے!

معاف کرنا۔ میری سطور واعظانہ حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور تم کہہ رہی ہوگی "یہ کہاں کی ہے دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح" "مگر میں کروں بھی کیا" "چارہ سازی" اور "غمگساری" کے قابل تو یہ دل رہا بھی نہیں۔ تم پوچھوگی کیوں؟ میں کہونگا "رہنے بھی دو اسے" یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ بڑی المناک اور دکھ بھری کہانی ہے اور وہ بھی پھر میری اپنی زبانی ——— اداس ہوں ———! سن نہ سکوگی۔ صبر کرو صبر۔ ابھی میرا سازِ محبت، مضبوط اور بہت مضبوط ہے۔ جب یہ شکستہ ہو جائے تب سُننا ہر تارِ نغمۂ غم سنائیگا، سن لینا۔ اچھا سنو!

ثریا اگر اس سال ادیب فاضل میں شریک ہو رہی ہے تو تم ضرور اس کا ہاتھ بٹاؤ اور اپنی تمام تفریحات رنگیں سے دستکش ہو کر ادب کی لاج رکھ لو تمہارا احسان ہوگا۔ یاد رکھو! ہر قوم کی ترقی کا انحصار اُس کے ادب پر ہوتا ہے معلوم ہے؟ آج جبکہ ساری دنیا، آگ و خون کی بھٹی بنی ہوئی ہے۔ امریکہ نے کیا کیا، جان و مال کی حفاظت سے پہلے جس کی حفاظت کی ہے، وہ ہے اُن کا ادب! جانتی ہو کس طرح؟ تمام کتابوں کے فلم تیار کرا لئے۔ پھر کیا تم اس سلسلہ میں کچھ ایثار و قربانی نہیں کرسکتیں؟ خیر تم جانو! بہرحال جس طرح بھی ممکن ہو ثریا کو امتحان میں پاس کرا دو۔ اس طرح اُردو ادب خطرہ کی زد سے بچ جائے گا اور ادب بھی وہ جس کو ہمارے آبا و اجداد نے ——— میں پھر بہکا۔ اچھا سنو! تم نے فلم نجمہ بھی دیکھا؟ ہاں! ہاں! وہی جس نے راس کماری سے ہمالیہ کی چوٹی تک دھوم مچا رکھی ہے، فلم بُرا نہیں تاہم خوب ہے مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متأثر کیا وہ اس کی زبان ہے، مکالمہ بھی تگڑا ہے، نجمہ کے یہ الفاظ بھلائے نہیں بھولتے "طلعت! ہندوستان کے شریف گھرانے کی عورت، اپنا رنج و غم، اپنا عیش و عشرت اور اپنا سب کچھ سینے میں دفن کرتی ہے اور مر کر شوہر کے گھر سے نکلتی ہے۔ طلعت! میں سب سمجھتی ہوں مگر اپنے فرض سے مجبور ہوں؟" ———! اسی طرح حضرت بیدل، ارے بھولا، حضرت نہیں، مسٹر بیدل کے یہ الفاظ کیا یاد رکھنے کے قابل نہیں "یوسف! تم میرے سچے، مخلص، ایک اور صرف ایک دوست ہو اس لئے میں تم کو ہوش میں لاکر رہونگا اور ایک نہ حاصل ہونیوالی چیز کے لئے تباہ و برباد نہیں ہونے دونگا؟" ———! کیوں؟ ہے نا پتہ کی بات! ممکن ہے کہ الفاظ صحیح نہوں اس لئے کہ عرصہ اور بہت عرصہ ہوا جب زیارت کی تھی۔ وہ بھی کس طرح؟ آنکھوں میں نیند تھی کہ سمٹی آ رہی تھی، پچھلے واقعات تھے کہ پردۂ سیمین پر رقص کر رہے تھے، بھولی بسری یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ ارے توبہ! میں پھر اڑا۔ ہاں تو جب نجمہ، ایسے سرمست و لاابالی شہزادے کو جس کے لئے "تانِ رباب" "بانگِ سحر" ہو، راہِ راست (الف ملیشا) پر لا سکتی ہے تو کیا تم سے یہ ممکن نہیں ——— ؟ آؤ! ملاؤ ہاتھ۔

اُٹھو اور اُٹھ کے نظامِ جہاں بدل ڈالیں

تم سوچتی ہوگی کہ یہ آج مجھے آخر ہو کیا گیا ہے، سر سے پیر تک بدلا ہوا نظر آ رہا ہوں، اور یہ ہے بھی واقعہ! محبت نفرت میں تبدیل ہو چکی ہے، ریشم نے کھدر کی جگہ لے لی ہے اور ہاں میرے پاس جو دیوان دیکھے تھے نا تم نے! جانتی ہو اُن کا کیا حشر ہوا، سنو! جگر کے "شعلۂ طور" کو تو احسان دانش کے "آتشِ خاموش" نے خاکستر کر دیا اور بہزاد کے "نغمۂ نور" کو اقبال کے "ضربِ کلیم" نے دبے ما ——— ارے! تمہیں تعجب کیوں ہے؟ ہاں ہاں! میں اب لبِ خشک اور آہِ سرد کی منزلوں سے دور بہت دور جا چکا ہوں۔ وہاں جہاں پہنچکر کوئی کہتا ہے:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب

میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

سنو! اِندنوں میرا مقصدِ حیات سماج کی اصلاح

اور اُردو کی خدمت کرنا ہے۔ بولو! دوگی ساتھ ــــــــ ؟
گر خوب سوچ لو تختۂ گل کو چھوڑ کر وادیٔ پُرخار میں قدم
رکھنا پڑے گا جس کی مجھے تم سے اُمید ہے۔ اور اُسے فرض
اور احساس ذمہ داری کے لئے تیار ہو جاؤ! اور جو کچھ ہوا
اُسے بھول جاؤ میں نے تم کو جو پہلا خط لکھا تھا وہ میرے
بجھے ہوئے دل کا آخری دُھواں ہے جسے تم نہیں سمجھ سکیں
اور خدا کرے کہ نہ سمجھو!

عشق کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

میری اچھی نجمہ! میں نے تمہارا خاصہ وقت ضائع کیا
اور بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ اس لئے اب رخصت، ہاں
ایک بات اور سنو، مگر دیکھو! کسی سے نہ کہنا۔ ذرا سر قریب لاؤ
تو کان میں چپکے سے کہہ دوں ــــــــ ! اچھا!
خدا حافظ۔ فقط

تمہارا

نجمی

ہماری ہر دلعزیز مطبوعات

	روپے	آنہ	پائی
ادب اور انقلاب	۳	۸	۰
گرداب	۳	۱۲	۰
لہریں	۳	۱۲	۰
افسانے اور ڈرامے	۲	۱۲	۰
زندگی کے نئے زاویئے	۳	۰	۰
مضامین عبدالماجد دریابادی	۴	۴	۰
محمد علی	۲	۱۲	۰
مردوں کی مسیحائی	۴	۴	۰
یقین و عمل	۲	۸	۰
مقالات محمد علی	۳	۱۲	۰
مقالات محمد علی حصہ دوم	۳	۱۲	۰

	روپے	آنہ	پائی
رنگ محل	۳	۱۲	۰
نغمات ماہر	۳	۰	۰
محسوسات ماہر	۳	۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱	۸	۰
کاروانِ علم	۳	۰	۰
اقبال کا تصور زمان و مکان	۳	۱۲	۰
سیاست جاپان	۰	۱۰	۰
اقبال کے خطوط جناح کے نام	۰	۵	۰
ابن خلدون کے سیاسی و معاشرتی نظریئے		۶	۰
جمہوریہ چین	۱	۱۲	۰

ادارۂ اشاعت اُردو عابد روڈ حیدرآباد دکن

محمد اقبال سلیم
(گاہندری)

تنقید و تبصرہ

اصول افسانہ نگاری

از اویس احمد ادیبؔ، حجم ۱۰۶ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت: عہ ۸ ناشر۔ اردو پبلشنگ ہاؤس الہ آباد۔

مختصر افسانوں کا رواج اردو زبان میں روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن مقبولیت کے ساتھ گھٹیا درجہ کے افسانوں کی بھرمار بھی ہو رہی ہے، ہر وہ شخص جو چار سطریں لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے افسانہ نگار بن بیٹھا ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ درجے کے افسانوں نے مذاق سلیم کا خون کر ڈالا ہے۔ جناب ادیب کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ اردو داں طبقہ کا ہر تیسرا فرد افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔"

افسانہ نگاری ایک فن ہے اور خاصا نازک فن، اس کو اور فنون کی طرح دقت نظر اور محنت ہی کے بعد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جو شخص اپنے اندر افسانہ نگار ہونے کی صلاحیت محسوس کرے اس کا فرض ہے کہ باقاعدہ مطالعہ اور مشق کے ذریعہ اس فن کو حاصل کرے یہ بڑا ظلم ہے کہ فوراً غلط صحیح، ایک مہمل، بے مقصد اور بے ربط افسانہ لکھکر چھپوانے کی سعی کی جائے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے افسانہ نگاری کے اصول اور لوازم پر بحث کی ہے، انگریزی زبان کے مختلف باکمال ناقدین اور افسانہ نگاروں کے خیالات درج کئے ہیں اور دلپذیر ترتیب کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ایک افسانہ نگار کو افسانہ لکھتے ہوئے کن امور کی تکمیل کا خاص خیال رکھنا چاہیئے ——— کتاب اپنے موضوع پر نادر اور اچھی کتاب ہے اور ہم جدید افسانہ نگاروں سے اس کے مطالعہ اور اس سے فائدہ اٹھانے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

دور جدید کے چند منتخب شعراء

از عبد الشکور ایم اے، حجم ۴۸ صفحہ تقطیع ۲۲×۳۵/۱۶ قیمت: عہ ناشر۔ دانش محل لکھنؤ۔

جناب عبد الشکور صاحب نے اس کتاب میں پنڈت رتن ناتھ سرشار سے رواں تک، اور جناب ساحر دہلوی۔ بے سلطہ لو پرشاد بسمل الہ آبادی تک جدید اردو زبان کے اکیس ہندو شعراء کا تذکرہ، ان کے کلام پر تبصرہ اور کلام کے نمونے درج کئے ہیں۔ ابتداء میں ایک بسیط مقدمہ اردو شاعری میں ہندوں کا حصہ سے متعلق ہے، اور مفید مضامین پر مشتمل ہے۔

عبد الشکور صاحب نے کتاب نہایت محنت کے ساتھ مرتب فرمائی ہے اور تبصرہ کرنے میں اصابت نظر سے کام لیا ہے۔ نمونہ کلام کو دیکھکر شاعری کی داد کے علاوہ عبد الشکور صاحب کے ذوق سلیم کی داد دینے کو دل چاہتا ہے، کتاب شروع سے آخر تک نہایت پر لطف اور بہت ہی مفید معلومات سے پر ہے، ہم عبد الشکور صاحب کو اس کتاب کی تالیف پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں کتاب معلومات آفریں ہے۔ اور حوالہ کی ایک اچھی کتاب کا کام دے سکتی ہے۔

اُردو تنقید پر ایک نظر

از کلیم الدین احمد۔ حجم ۲۲۶، $\frac{20 \times 30}{16}$ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت:۔ عہ۔ مرکزِ ادب، بلند رود پٹنہ

اُردو میں تنقید نگاری کی عمر ابھی بہت ہی کم ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں کہ ہمارے یہاں تنقیدِ ادب کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اور جیسے ہر چیز کی ابتدا تکمیل طلب صورت حال سے ہوتی ہے! "تنقیدِ ادب" بھی تکمیل طلب ہے، زیر نظر کتاب تنقید کی تنقید ہے اور تبصرہ پر تبصرہ، اپنے موضوع پر یہ نادر کتاب ہے مصنف نے اُردو ادب کی تاریخوں اور تذکروں پر تنقید کی ہے۔ اُردو میں فن تنقید کی تاریخ پر بحث کی ہے۔ ہمارے اُصول تنقید پر کیا کیا اثرات پڑے ہیں، اس کا ذکر کیا ہے۔ ہم مصنف کی اس رائے سے بالکل متفق ہیں کہ آج کل جانبداری کے ساتھ جو تنقید کی جاتی ہے وہ تنقید نہیں بلکہ قصیدہ خوانی ہے۔ اور اسی طرح مخالفت کی وجہ سے جو تنقیص لکھی جاتی ہے وہ محض ہجو ہے۔ اس سے ادب کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچتا ہے۔

کتاب دلچسپ بھی ہے اور معلومات آفریں بھی۔ لیکن مصنف کا قلم تذکروں پر تنقید کرتے ہوئے تنقیص پر آگیا ہے۔ جو کسی سنجیدہ نگار کے لئے مناسب نہیں۔ کتاب اچھی ہوتی اگر مصنف ذرا وسعتِ نظر سے کام لیتے۔

شمیم کے سو شعر

قیمت:۔ ۴ر عثمانیہ بلڈپو۔ محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳

سید مظفر حسین صاحب شمیم کی غزلوں میں سو شعر منتخب کر کے سید جمیل الدین صاحب نے یہ کتابچہ شایع کیا ہے اشعار میں کوئی ندرت تو نہیں البتہ زبان و بیان صاف ہیں۔ انداز کسی قدر واقعاتی و وارداتی ہے اس لئے اشعار میں ایک قسم کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

کنول

حکیم میر کاظم علی برق موسوی $\frac{20 \times 30}{16}$ ۸۰ صفحات مجلد خوشنما۔ قیمت:۔ ۱ر مرکزِ ادب قطبی گوڑہ حیدرآباد دکن۔

نوجوان شاعر برق موسوی کی ۴۴ مختصر بہاریہ نظموں کا مجموعہ، جناب برق کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر زمانہ سازگار رہا اور مشقِ سخن جاری رہی تو ایک دن یہ اچھے شاعروں میں ہوں گے۔ ان کے کلام میں شاعرانہ عناصر کی کمی نہیں البتہ ابھی پختگی نہیں ہے، مشق اور محنت کی ضرورت ہے، جذبات شاعرانہ ہیں، انداز شاعرانہ ہے بیان شاعرانہ ہے، مگر بیان پر قدرت مشق و محنت چاہتی ہے، ہمارا مشورہ ہے کہ برق صاحب مشق جاری رکھیں، اور بیان میں زور پیدا کرنے کی سعی کریں۔

اَدب اور زندگی

مجنوں گورکھپوری، ۱۶۸ صفحہ $\frac{20 \times 30}{16}$ مجلد۔ قیمت عہ دانش محل لکھنو۔

حضرت مجنوں گورکھپوری۔ اُردو زبان کے پختہ مشق ادیبوں میں سے ہیں۔ ان کے قلم سے اب تک متعدد نفیس اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں نکل چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ترمیم و اضافہ کے بعد دوسری مرتبہ شایع ہوا ہے۔ یہ مضامین حسب ذیل عنوانات پر ہیں:۔

ادب اور زندگی، مبادیات تنقید، زندگی اور ادب کا بحرانی دور، ادب اور ترقی۔ ہندوستانی ناٹک۔ نظیر اکبر آبادی ضمیمہ۔ حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں، نیا ادب کیا ہے۔ اُردو مختصر افسانے میں جدید رجحانات۔

حضرت مجنوں کی نظر بہت سے فرزانوں سے زیادہ باریک ہے، وہ تنقید کرتے ہوئے جس قدر سلجھے انداز میں اُصولی بحث کرتے ہیں وہ بہت سے ناقدین کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

اُجرتی محنت اور سرمایہ

کارل مارکس، مرتبہ عابد علیخاں بی۔اے

$\frac{20 \times 30}{16}$ ۴۰ صفحات قیمت ۱۲/ ادارۂ اشاعت گھر حیدر آباد دکن۔

یہ کتاب کارل مارکس کے ایک مشہور مضمون کا ترجمہ ہے اور اشتراکی پروپیگنڈا کے سلسلہ میں اشاعت گھر نے شایع کیا ہے۔ کارل مارکس کی تحریروں کا ترجمہ بڑا مشکل کام ہے، اول تو یہ ترجمہ در ترجمہ کا کام ہوتا ہے دوسرے یہ کہ خود کارل مارکس اپنی بے مغزی کو تحریر کی الجھاوٹ میں چھپانے کا عادی تھا۔ اس لئے یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، لیکن جناب عابد علی خاں صاحب نے بڑی کامیابی کے ساتھ مفہوم کو اردو میں ادا کیا ہے جس کے لئے وہ صحیح معنی میں داد کے مستحق ہیں۔

رسالہ منزل یہ رسالہ چھوٹی تقطیع پر ماہانہ فرنگی محل لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے۔ سالانہ قیمت (ـعہ) ہے۔

فروری و مارچ ۱۹۴۴ء کا مشترک شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے جو مع اشتہارات کے چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ رسالہ اردو کے جدید مارکس زدہ ادب سے متاثر اور اسی کا منادی معلوم ہوتا ہے۔ اس نمبر میں ابتدائی مضمون عبدالعلیم صاحب کا ہے جو نئے ادب کی حمایت میں ہے۔ بعض مشہور شعرا مثلاً حسرت موہانی وغیرہ کے اشعار بھی اس میں شامل ہیں۔ رسالہ اچھا ہے، ضرورت ہے کہ اس کی ظاہری صورت کو بھی حسین بنایا جائے۔

گلدستۂ معرفت اولیا مجموعۂ کلام حضرت سید شاہ احمد حسین صاحب جعفری، تقطیع $\frac{20 \times 26}{16}$ حجم ۵۰ صفحات کاغذ و طباعت نہایت نفیس قیمت:- عالی۔ کسیرز اینڈ کمپنی جانسٹن گنج، الہ آباد۔

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر

جلد (۲)

نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

(چودھری) محمد اقبال سلیم گاہندری

چندہ سالانہ چھ روپیہ کلدار — فی پرچہ آٹھ آنہ کلدار

مندرجات

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

اشارات

"پیام ادب" کا یہ شمارہ ایک طویل غیر حاضری کے بعد آج پیش ہو رہا ہے۔ ہمیں افسوس ہے اور شدید افسوس کہ "پیام ادب" جس کی پابندی اوقات ، اور نظم اشاعت ہمیشہ ایک قابل فخر خصوصیت رہی۔ جدید ، بہتر اور زیادہ محکم انتظام کے انتظار میں اپنے قدردانوں کے لئے طویل غیر حاضری کی بنا پر تکلیف دہ بن گیا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ حالات اور مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے کوشش کی کہ اس کی حاضری کو زیادہ موثر بنانے کے لئے کسی قدر غیر حاضری برداشت کر لی جائے۔ مگر اس پُرآشوب زمانہ میں یہ کوششیں بڑی دیر سے بارآور ہوئیں۔ اور ہم آج سے پہلے رسالہ نہ پیش کر سکے۔ اب امید ہے کہ انشاءاللہ اس کی پابندیٔ وقت میں فرق نہ آنے دیا جائے گا۔

ہماری کوششیں ہرگز بارآور نہ ہوتیں اگر مولوی سید عبدالرزاق صاحب مالک ادارۂ اشاعت اردو و اعظم اسٹیم پریس کی حوصلہ مند طبیعت اور اُن کا بے پناہ جذبۂ خدمتِ ادب ساتھ نہ دیتا۔ موصوف نہ صرف ایک ماہر طباعت ہیں۔ اور نہ صرف جنوبی ہند کے سب سے پہلے ناشر و کتب فروش کی حیثیت سے ایک ممتاز و رفیع مقام رکھتے ہیں۔ بلکہ اپنے حساس قلب میں خدمتِ علم و ادب کا بے پناہ جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ اور چونکہ ایک طابع و ناشر کو جن امور پر قابو حاصل رہنا چاہیے۔ ان پر قابو رکھتے ہیں۔ جنوبی ہند کے سب سے ترقی یافتہ اور عظیم الشان مطبع کے مالک ہیں۔ اس لئے اُن کا جذبۂ خدمتِ علم و ادب کے لئے ہمیشہ مفید و معین ثابت ہوتا ہے۔

ادارۂ اشاعت القرآن مولوی سید عبدالرزاق صاحب نے اس کو محسوس کیا کہ کاغذ و سامان طباعت کی گرانی نے کتب فروشوں کو اس کا موقع پیدا کر دیا ہے کہ قرآن حکیم کے ہدیہ میں من مانے اضافے کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج قرآن کریم کے نسخے بہت ہی گراں ہدیہ میں میسر آتے ہیں۔ اور غریب مسلمان کے لئے انہیں حاصل کر کے کسب نور کرنا دشوار ہو گیا۔ یہی حال دوسری مذہبی کتابوں کا ہے ــــ اس ضرورت کا احساس کرنے کے بعد موصوف نے بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ ایک ادارہ اشاعت القرآن کے نام سے قائم کرنے کا فیصلہ کیا ــــ ماہ فروری میں فضیلت مآب حافظ قرآن مجید نواب صاحب چھتاری صدر اعظم دولت اسلامیہ آصفیہ اپنے دست حق پرست سے اس کا افتتاح فرمائیں گے۔ امید ہے کہ قرآن مجید کے صحیح ترین نسخے اور مذہبی کتابیں اس کے بعد آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکیں گی اس ادارے کو مفید تر بنانے کے لئے علمائے کرام اور محققین عظام کی ایک مشاورتی مجلس بنائی گئی ہے جو ہمیشہ اس ادارہ کو مفید تر مشورہ دیتی رہے گی۔

اقبالیات علامہ اقبال ، خودی کے پیغامبر ، اور وہ عظیم الشان فلسفی تھے جن کے متعلق ہم جتنا زیادہ لکھیں کم ہے۔ ادارہ اشاعت اردو نے طے کیا ہے۔ کہ علامہ اقبال کی تعلیمات سے متعلق بیش بہا کتابوں کا ایک مفید سلسلہ پیش کرے۔ اب تک اس سلسلہ کی تین کتابیں

۱ ۔ روح اقبال ۔ مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۔
۲ ۔ آثار اقبال ۔ مؤلفہ غلام دستگیر رشید ۔ ایم۔ اے پروفیسر نظام کالج

۴۔ فکرِ اقبال۔ مؤلفہ غلام دستگیر رشید ایم ۔اے پروفیسر نظام کالج ۔

پیش کی جا چکی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اپنے معیار کی بلندی ، افادیت کی وسعت اور علمی وزن کے اعتبار سے اپنا آپ ہی جواب ہے ۔ انشاء اللہ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل کتابیں عنقریب پیش کی جائیں گی

حکمتِ اقبال

مقامِ اقبال

اقبال کا فلسفۂ خودی

تصوراتِ اقبال ۔

امید ہے کہ اس طرح یہ سلسلہ اقبال کے سمجھنے کے لئے ایک مکمل سلسلہ ثابت ہوگا ۔ اور متعلمینِ اقبال کو کسی اور طرف نظر کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی ۔

اس ماہ کے مضامین

"پیام ادب" کی روایات کے مطابق اس ماہ کے مضامینِ نظم و نثر بھی اپنی افادیت اور اپنے معیار کی بلندی میں ایک خاص مقامِ رفیع رکھتے ہیں۔ نثر میں حضرت مجنوں گورکھپوری کا مضمون "حضرت آسی کا تغزل" تنقید غزل پر بہترین مضمون ہے ۔ حضرتِ مجنوں ہماری زبان کے بہترین تنقید نگاروں میں سے ہیں۔ اور لتنے مشہور و معروف صاحبِ قلم ہیں کہ ہمیں ان کا تعارف کرانے کی نہ جرأت ہے اور نہ ضرورت

"**فریبِ مسلسل**" کے نام سے تسنیم سلیم چھتاری کا لکھا ہوا افسانہ پیش ہے۔ اردو زبان میں فسانہ نگار خواتین اور بھی ہیں لیکن تسنیم کی تحریر میں ایک خاص انداز پایا جاتا ہے۔ 'زبان کی گھلاوٹ' اور 'فقروں کی چستی' کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کی دلآویزی تسنیم کو امتیاز دیتی ہے ۔

"**بھگوان اور بیل**" بچوں کی نفسیات اور دوسری متعدد کتابوں کے مشہور مصنف جناب شیر محمد اختر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور "مشک آنست کہ خود ببوید" کا مقام رکھتا ہے ۔

"**سامانِ جنگ**" ۔ اردو زبان کے مشہور ناول نگار قیسی رامپوری نے لکھا ہے ۔ اور ہر اعتبار سے کامیاب لکھا ہے۔

مضامینِ نظم میں حضرت اقبالؒ کی ایک نظم "لالۂ صحرا" شائع کی جارہی ہے ۔ ارادہ ہے کہ ہر شمارہ میں اقبالؒ کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور شائع کی جائے ۔ تاکہ ناظرین کو اقبالؒ کے کلام سے بار بار لطف اندوز ہونے کا موقع ملے زمانہ کی رفتار سے اقبال کا کلام پرانا نہیں ہوسکتا ۔ وہ اب بھی جدید ہے ۔ اور ہمیشہ جدید ہی رہے گا ۔

اس کے علاوہ صمد رضوی کی نظم "سراپا" کامیاب ، دلچسپ اور زورِ قلم کا بہترین نمونہ ہے ۔ ان نظموں کے علاوہ اس حصہ میں نواب فصاحت جنگ جلیل کی غزل ، سکندر علی وجد کی نظم ، ماہر القادری کی عقیدت کے پھول ، اور جذب عالمپوری کا کلام شامل ہے ۔

امید ہے کہ ناظرین ان مضامین سے بہت لطف اندوز ہوں گے ۔

اِدارہ اِشاعت اُردو کی نئی کتابیں!

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
(۱)	روحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	صہ/۱۲
(۲)	فکرِ اقبال	غلام دستگیر رشید ایم اے	للعہ
(۳)	آثارِ اقبال	〃 〃 〃	ہے/۱۲
(۴)	فلسفۂ عجم	علامہ اقبال	ہے/۴
(۵)	نگارشاتِ محمد علی مرحوم	رئیس احمد جعفری	ہے/۱۲
(۶)	افاداتِ محمد علی مرحوم	〃 〃	ہے/۱۲
(۷)	تنقیدی حاشیے	سید احتشام حسین	ہے/۱۲
(۸)	داستانِ اردو	نصیر حسین خیال	عہ/۱۲
(۹)	ذکرِ جمیل	ماہر القادری	عہ/۱۲
(۱۰)	وسوسے	فضل حق قریشی	عا
(۱۱)	سرنوشت	مجنوں گورکھپوری	عا/۱۲
(۱۲)	صیدِ زبوں	〃 〃	عا
(۱۳)	سراب	〃 〃	ہے/۶
(۱۴)	نگینے	مظفر حسین شمیمؔ	عا
(۱۵)	تعبیریں	محمد امین شرقپوری	عا/۱۲
(۱۶)	اسرار	علی اختر	عا/۱۲
(۱۷)	دھوپ	قیسی رام پوری	ہے/۴
(۱۸)	ترقی پسند ادب	عزیز احمد	عا/۱۲
(۱۹)	مکالماتِ ابوالکلام	عقیل احمد جعفری	ہے/۸
(۲۰)	سزا	قیسی رام پوری	ہے
(۲۱)	خط	〃 〃	ہے/۸
(۲۲)	غبار	〃 〃	ہے
(۲۳)	ہچکیاں	صدیقہ بیگم سیوہاروی	ہے/۴
(۲۴)	محسوساتِ ماہر	ماہر القادری	عا/۱۲
(۲۵)	نغماتِ ماہر	〃 〃	ہے
(۲۶)	اسلامی تہذیب کیا ہے؟	غلام دستگیر رشید	عا/۸
(۲۷)	ناتسیت	شاہد حسین رزاقی	عا/۱۲
(۲۸)	میخانہ ریاض	تسنیم مینائی	ہے/۴
(۲۹)	نفسیاتِ زندگی	شیر محمد اختر	عہ/۱۲
(۳۰)	بچوں کی نفسیات	〃 〃	عہ/۱۲
(۳۱)	زلزلے	قدوس صہبائی	عا/۱۲
(۳۱)	کروٹیں	〃 〃	عا/۱۲
(۳۲)	یقین و عمل	عبدالقدوس ہاشمی	عا/۸
(۳۳)	ادب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	ہے/۸
(۳۴)	قصص و مسائل	مولانا عبدالماجد دریابادی	عہ/۱۲
(۳۵)	کاروانِ علم	فیض محمد صدیقی	ہے
(۳۶)	مقالاتِ محمد علی حصہ اول	رئیس احمد جعفری	ہے/۱۲
(۳۷)	مقالاتِ محمد علی حصہ دوم	〃 〃	ہے/۱۲

لالۂ صحرا

از علامہ اقبال

یہ گنبدِ مینائی! یہ عالمِ تنہائی! مجکو تو ڈراتی ہی اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو منزل ہی کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟

خالی ہی کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ تو شعلۂ سینائی! میں شعلۂ سینائی!

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سی کیوں ٹوٹا اِک جذبۂ پیدائی! اِک لذتِ یکتائی!

غوّاصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی!

اُس موج کے ماتم میں روتی ہی بھنور کی آنکھ دریا سے اٹھی لیکن ساحل سی نہ ٹکرائی!

ہی گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی!

اے بادِ بیابانی مجکو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

تسنیم سلیم چھتاری

فریبِ مسلسل

" چھیڑ دینا اپنی محفل میں ہماری داستاں
صرف اتنا دیکھ لینا اشک بھر لاتا ہے کون"
(بہزاد)

جب بنیاد رکھی گئی شاید اس نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ یا تو بہت عالیشان بناؤں گا یا پھر اپنے ہاتھوں ہی مسمار کر دوں گا . . . . وہ اس دنیا میں زندگی کا بہت اعلیٰ مقصد لے کر آیا تھا وہ کھلونا نہیں کھلاڑی بننا چاہتا تھا . . . . . جوانی کے لئے وہ بچپن ہی سے خیالات کے محل بنا رہا تھا . . . . . اور بہت سی انہونی باتیں سوچتے سوچتے وہ جوانی کی حدود میں داخل ہوگیا۔

اب بی۔ اے ہو گیا تو کوئی بزنس شروع کر دونگا۔ . . . . ایک موڈرن اسٹائل کا مکان بہترین فرش کیا ہوا . . . . سجا اسے اپنے ڈرائنگ روم میں ایجنتا کی تمام سنگ تراشیاں نظر آتیں . . . . . سوچتا کہ گرمیوں میں کسی سرد جگہ چلا جایا کرونگا کشمیر کی گلپوش وادیاں اور نینی تال کے نشیب و فراز سب میرے منتظر رہا کریں گے . . . . . کالج سے گھر تک کی لمبی سڑک پر تانگے کے جھٹکے اور سائیکل کی گھنٹی اس کی ہم آہنگی کرتی اور خیالات کے ہجوم میں اسے اپنے دوش بدوش ایک عورت بھی نظر آتی شعر کی طرح لطیف اور گیت کی طرح نازک . . . . . اور ہاں دور بہت دور دھندلکے میں ننھے بچے . . . . . مسرت سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگتیں اور سائیکل بے قابو ہو جاتی۔

مفلس انسان کے خیالات باغیانہ ہوں تو بہت مشکل پیش آتی ہے یہی اس کے ساتھ بھی ہوا نوکری تو غلامی ہے اور خوشامد کرنا ذلت . . . . . . زندگی کی بوجھل گاڑی دنیا کے خاردار راستوں میں کس طرح گھسیٹی جاتی . . . . . بی اے بھی ہو چکا مگر اب کیا کرے بیکار بیٹھا رہا . . . . .

خودداری اچھی چیز ہے مگر نادار انسان کا اس سے کیا جوڑ وہ احسان مند نہیں محسن بننا چاہتا تھا اور یہی چیز اس کے اور دولت کے درمیان میں حائل تھی۔

وقت گزرتا گیا مگر اس کے خواب حقیقت نہ بن سکے . . . . . ہر دفعہ اپنا عہد یاد آتا "جب دلخواہ نہ جی سکا تو زندگی کا یہ تار ایک ہی جھٹکے سے توڑ دونگا" اور اس تار سے تو اور زندگیاں وابستہ تھیں معصوم بہن اور بڈھے ماں باپ! انسان تو وہ ایک ہی تھا جس کا فرض تھا کہ اپنی انسانیت کا خون بہا کر اپنے احساس کا گلا گھونٹ کر اسی طرح ناکام اور نامراد جیتا رہے۔

بہن کی شادی ہوئی اس کے دل میں کیا کیا ارمان نہ تھے مگر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعاؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا . . . . . یہی اس کی زیست کا سرمایہ تھا بیٹی کے جانے سے ماں کی اداسی اور بھی بڑھ گئی اور ایک دن! "جب تم چھوٹے تھے تو میں تمہارے متعلق بہت کچھ سوچا کرتی تھی" "تو کیا اب آپ میرے متعلق کچھ نہیں سوچتیں . . . ؟"

" جو کچھ آج تک سوچا تھا وہی پورا نہ ہوا . . . . . صرف سوچنے سے تو دل مطمئن نہیں ہوتا . . . . . . کیا کیا اُمنگیں تھیں میرے دل میں!"

اُمیدیں ناکامی کے اندھیرے میں سو جائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے . . . . . وہ کانپ گیا . . . . .

" آپ یہی چاہتی ہیں نا . . . . . کہ میں نوکری کروں "

" تم بلا سے نوکری نہ کرو . . . . . بیٹے پیدا ہوتے تھے تو

مائیں سوچا کرتی ہیں کہ ان کے دم سے گھر آباد ہوگا . . . .
ان سے اپنا نام چلے گا . . . . . . میرا تو بیٹا بھی صرف
ایک ہے . . . ."

"ماں . . . . . . یہ کیا کہہ رہی ہیں . . . . .
ایک اور زنجیر . . . . "

"زنجیر . . . . . . ہاں زنجیر ہی سہی مگر تم نہیں
جانتے یہ ان کی خواہش ہے جو بہت جلد تمہارے پیروں
سے اپنی زنجیریں کاٹ دیں گے تمہارے بڈھے باپ کی
کتنی تمنا ہے کہ وہ تمہاری بہو دیکھیں . . . . . . ہو سکتا
ہے کہ اس کے بعد ہم تم سے کچھ اور فرمائش کرنے کو نہ رہیں"
باپ کو خوش اور ماں کو مطمئن کرنے کے لئے . . . .
اس نے ہنسکر ہنسکر اپنے کو پابند سلاسل کیا . . . .
دل رو رہا تھا کیا یہی ہے اس کے خواب کی تعبیر!!

شادی کی رات وہ بہت افسردہ تھا . . . . .
اس نے دیکھا کہ رضیہ کی آنکھوں نے ابھی صرف خوشی
کے آنسو چھلکائے ہیں . . . . . کیا اسے بھی میرے
ساتھ اپنی تباہ حالی پر نوحہ کناں ہونا ہے۔ رضیہ اس کے
بازوؤں کی طاقت اور سینے کی چوڑائی دیکھ کر مسرور تھی
اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے چہرے سے گھونگٹ اٹھاتے
وقت یہ ہاتھ کس طرح کانپے تھے اور اس کا معصوم چہرہ
دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بہت سی نامکمل انگڑائیاں
پاکر اس چوڑے سینے میں دل کس طرح چور چور ہو گیا
تھا . . . . "

ماں اور باپ دونوں اولاد دیکھنے کی تمنا لے کر
اس کا ساتھ چھوڑ گئے . . . . وہ اب بھی نہ مر سکا
. . . . . رضیہ نے کیا گناہ کیا ہے . . . . اسے
جینا ہی پڑا۔

"رضیہ میں کتنا بدنصیب ہوں . . . . . تمہارے
لئے کچھ بھی نہیں کر سکا"

"مجھے کیا چاہیئے"

"سچ کہہ رہی ہو تمہیں کچھ نہیں چاہیئے شوہر کی بے رحم
ہستی کے سوا تمہیں کسی چیز کی خواہش نہیں . . . . . .
میں لے اپنے آنسوؤں سے اپنی آہوں سے تمہاری ہر
تمنا کو پورا کر دیا ہے . . . . "

"اور تم کر بھی کیا سکتے ہو . . . . "

"میں . . . . . نہیں نہیں ابھی کچھ نہیں بگڑا۔
. . . . . . ابھی سب کچھ میرے اختیار میں تمہاری اور
اپنی تکلیف کا ازالہ کر سکتا ہوں . . . . . . "

رضیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا
مطلب"

"رضیہ" اس کی آواز بھرا گئی "مجھے آج تک اپنی
مرضی کے خلاف جینا پڑا ہے . . . . . . کم از کم خواہش
کے مطابق موت تو نصیب ہو جائے . . . . . . تمھیں
اپنے سینکڑوں قدر دان مل جائیں گے تم اپنی زندگی
کامران بنا لو میری روح ہمیشہ مطمئن رہیگی"

"تم کتنے سنگدل ہو"

"پھر کیا کریں"

"کیا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں . . . . .
تم تنہا نہیں مر سکتے تمہارے ہاتھوں ایک اور خون ہوگا
. . . . . . شاید دو . . . . "

جس پر مسرت خیال سے سائیکل پر اس کی ٹانگیں
کانپ جاتی تھیں اس کی حقیقت محسوس کر کے اس کا
سر چکرا گیا۔

"میں باپ بننے والا ہوں" کسی نے اس کے کانوں
میں چیخ چیخ کر کہنا شروع کر دیا "پاؤں کی بیڑیاں بڑھ
رہی ہیں تو اب نہیں مر سکتا تجھے اسی طرح جینا ہوگا . . . .
تجھے اب کچھ کرنا بھی پڑے گا . . . . اس بدنصیب
بچے کا مستقبل سنبھالنے کے لئے . . . . "

ماں باپ کی موت نے اسے بہت بزدل کر دیا تھا
وہ ہمیشہ سے رونے کا عادی تھا جب تک ماں زندہ تھی وہ

دل پر ہر نیا زخم لگ جانے کے بعد اسی کی گود میں سر رکھ کر رویا کرتا تھا اور ماں کی موت کے بعد وہ رضیہ کے سامنے رونے لگا تھا۔ کیا اب وہ اس بچے کے سامنے بھی رویا کرے گا ...... وہ کبھی نہیں ہنستا تھا مگر اب ہنسا کرے گا۔ وہ اپنے بچے کے لئے کہیں سے ہنسی لائے گا ایسی ہنسی جو زندگی کے سارے غم بہلا دے وہ بچے کی زندگی سے تمام آنسو نچوڑ کر پھینک دے گا ...... مگر یہ بچہ اسے کیا حق تھا اس دنیا میں آنے کا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ بچہ پیدا ہی نہ ہو ...... میں اسے ورثہ میں آنسوؤں کے سوا دے بھی کیا سکونگا" پھر اسے رضیہ کا خیال آیا شادی کے شروع دنوں میں وہ کتنی خوش رہتی تھی اور اب ہر وقت مغموم اداس اور کھوئی کھوئی .... کیا پتہ یہ بچہ رضیہ کو اس کی گمشدہ مسرت واپس دلا دے ...... "مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا" ......

وہ ساری باتیں جو آج تک محض سوچی گئی تھیں اب کہی جانے لگیں وہ سارے ارمان جو دل میں گھٹ گھٹ کر رہ رہے تھے اب منظر عام پہ لائے گئے ...... اس نے افسانہ نگار بن کر اپنی خواہشوں کی نمائش شروع کر دی وہ خود کبھی گرمیوں میں بجلی کا پنکھا بھی نہ چلا سکا مگر اس کے ہیرو گرمیاں گزارنے شملہ اور مسوری جاتے بعض اوقات اسے تانگہ کا کرایہ بھی گراں گزرتا اور اس کے افسانوں کے کردار موٹروں اور ہوائی جہازوں میں اڑے پھرتے ...... وہ خود بھی اپنے افسانوں میں غرق ہو کر اپنے کو بھول جاتا اور یوں اسے ذہنی سکون اور پیسہ دونوں مل رہے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا "مبارک ہو لڑکا" ......

بچہ بالکل ماں کی صورت تھا ...... آج بہت دن بعد رضیہ کے چہرے پہ وہی دلکش مسکراہٹ نظر آتی جس کا اب ہلکا سا نشان بھی نہ بچا تھا۔

اس کے افسانے بہت مقبول ہو رہے تھے اور جب سے بچہ پیدا ہوا اس نے کام بھی بڑھا لیا تھا ...... رات کے دو دو بج جاتے اور وہ میز پہ جھکا ہوا لکھتا رہتا رضیہ کہتی۔

"بس اب اٹھیئے صبح کو لکھیئے گا"

"ہاں بس ایک ذرا اور ......" اور اس کا سر میز پر اور بھی جھک جاتا۔

دن رات کی محنت نے صحت کا ستیاناس کر دیا روز سر میں درد ہونے لگا کبھی کبھی حرارت بھی ہو جاتی ڈاکٹر نے کہا دو مہینے کے لئے کسی سرد مقام پر چلے جاؤ رضیہ نے کہا "ضرور چلیں گے" وہ محض ہنسکر رہ گیا۔

بچہ دو سال کا ہو گیا تھا ...... دونوں دن رات بیٹھ کر اسی کے متعلق باتیں کیا کرتے ...... جب کوئی نیا افسانہ مکمل ہو جاتا تو وہ اطمینان سے مضمحل جسم کو بستر پہ گرا کر رضیہ سے بچے کے متعلق پوچھتا۔

"کیوں رضیہ تمہارا کیا خیال ہے ہمارا بچہ بڑا ہو کر کیسا انسان بنے گا۔

"بالکل تمہاری طرح" رضیہ مذاق سے کہتی۔

"خدا نہ کرے ...... میرا اس پر اثر نہ پڑے ...... میں بہت بد نصیب ہوں .... یہ تو ......" اور پھر نہ جانے وہ کیا کیا باتیں سوچنے لگتا ......

بچے کو ٹھنڈ ہو گئی اسے خود کو بھی بخار رہتا مگر ساری رات پٹی سے لگا رہا ...... بچے کو نمونیا ہو گیا اور تین دن تک دونوں ایک مسلسل کرب میں مبتلا رہے آخر چوتھے دن اس کا ننھا بچہ رضیہ کی گود سے چھن کر موت کی سرد اور مغموم آغوش میں چلا گیا ...... اس نے لرزتے ہاتھوں سے بچہ کو اٹھا لیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

"دیکھو میرے بچے کو کیا ہو گیا یہ ہنستا کیوں نہیں

یہ بولتا کیوں نہیں یہ ٹھنڈا کیوں ہوگیا ہے یہ جاگتا کیوں نہیں" جب بچے کو زبردستی اس سے لے لیا گیا تو اس نے بیہوش رضیہ کو جھنجوڑنا شروع کیا" تم کہتی تھیں کہ یہ بے چین ہے اسے نیند نہیں آتی ...... دیکھو یہ کیسا بے خبر سو رہا ہے اب تو اسے بخار بھی نہیں ......"

حواس درست ہوئے تو سرشت ہی بدل چکی تھی ... ہنسنا بھول گیا تھا رونے کے لئے اب آنکھوں میں آنسو بھی نہ بچے تھے ...... شراب کی سیاہ بوتلیں اور زردی و سفیدی کا مجسمہ رضیہ دونوں اس کے غم کو اس سے نہ چھڑا سکے صدمے اور شراب نے اس کی رہی سہی صحت بھی برباد کردی۔ سینے میں درد رہنے لگا۔

ڈاکٹر نے کہا" پھیپڑے خراب ہو رہے ہیں۔ علاج ہونا چاہیئے چھ مہینے بالکل آرام کرو"

اس نے فیس میز پر رکھی اور خالی جیب ہلاتا ہوا گھر آگیا۔

"رضیہ مجھ سے ان بڑے شہروں میں نہیں رہا جاتا جہاں تہذیب کا دیا انسانیت کے روغن سے جلایا جاتا ہے۔

"کیا ہوا" رضیہ نے پرنم آنکھیں اٹھائیں"

"کب تک کہوں کہ کیا ہوا زندگی صرف زخموں اور اس کے اندمال ہی کا نام نہیں زندگی صرف آہوں اور سسکیوں ہی کا مجموعہ نہیں آنکھیں صرف رونے کے لئے ہی نہیں بنائی گئیں میں ہنسنا بھی چاہتا ہوں مجھے خوش رہنے کی بھی تمنا ہے ......"

"پھر کیا کریں"

"کچھ نہیں اپنے کو فریب دیتا آیا ہوں اور دیتا رہوں گا"

اس نے قلم اٹھایا اور لکھنے لگا۔ برابر کے مکان میں ریڈیو بج رہا تھا۔

"یہ زندگی فریب مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہوگیا ہوں میں

نواب فصاحت جنگ جلیل

جنکے جلوے یہ سرِ طور نظر آتے ہیں
دِل کے پردے میں وہ مستور نظر آتے ہیں

کھینچ دی خُلد کی تصویر بہارِ گل نے
پھُول جتنے ہیں رُخِ حور نظر آتے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیم
اِک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں

تھک گیا قافلہ زیست بھی چلتے چلتے
ابھی منزل کے نشاں دور نظر آتے ہیں

ہر نظر اسکی چھلکتا ہوا ساغر ہے جلیل
آج ہم پینے پہ مجبور نظر آتے ہیں

مجنوں
گورکھپوری

حضرت آسی کا تغزل

اس قدر درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخن آسی شیدا غزل میر نہ ہو

میرے مقالہ کا موضوع حضرت آسی غازی پوری کی شاعری اور انکا وہ نرالا انداز تغزل ہے جس کی بنا پر خود شاعر کو احساس ہے کہ اس کی شاعری اکثر "غزل میر" کے رتبہ کو پہنچ جاتی ہے جیساکہ اس نے اپنے شعر میں ظاہر کر دیا ہے۔

دنیا میں محرومی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو یہ کہ جس چیز کو چاہو وہ نہ ملے۔ دوسری یہ کہ ایک ملی ہوئی دولت کی صحیح اور کما حقہٗ قدر نہ کی جائے۔ اگر ایک طرف ایسوں کی تعداد بے شمار ہے جو عمر بھر اکسیر کی تلاش کرتے رہے اور نہ پا سکے تو دوسری طرف ایسوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کو اکسیر ملنے کو تو بارہا ملی مگر وہ بیشتر اوقات اس کو خاک سمجھتے رہے۔ میں جب آسی غازی پوری کی شاعری پر غور کرتا ہوں اور پھر اس ناشناسی اور بیگانہ وشی کو دیکھتا ہوں جس کو اردو شاعری کے نقادوں نے ان کے حق میں برتا ہے تو مجھے اس دوسرے ہی قسم کی محرومی کی مثال نظر آتی ہے۔

آج مجھے کوئی قابل قدر تاریخ شعر اردو ایسی یاد نہیں آتی جس میں آسی کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہو مولانا عبدالسلام ندوی جیسا بالغ نظر اور ہمہ گیر مورخ دو جلدیں "شعرالہند" کی لکھ ڈالتا ہے اور مشکل سے کسی ایک جگہ آسی کا نام لیکر چپ ہو جاتا ہے اور پھر نہ ان کی شاعری پر کوئی رائے دیتا ہے اور نہ ان کا ایک شعر درج کرتا ہے۔ کیا آسی کے سارے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہ نکل سکا جس کو تغزل یا تصوف یا کسی اور عنوان کے ماتحت مثالاً پیش کیا جا سکتا؟ کہا جا سکتا ہے کہ آسی کا مرتبہ شاعر سے بہت بلند تھا اور شاعری ان کے لئے باعث فخر نہ تھی۔ وہ خانقاہ رشیدیہ کے سجادہ نشین تھے اور ایک صاحب باطن مرشد اور یہی انکی اصل بزرگی اور برگزیدگی ہے جس کے سامنے ان کی ساری شاعری شرما کر منہ چھپا لیتی ہے یہ آسی خود کہتے تو ہم خاموش ہو جاتے یا پھر اگر کوئی اِن کا ایسا مرید کہتا جو شاعری کا مبصر نہوتا یا کم از کم شاعری پر تنقید کرنے نہ بیٹھا ہوتا تو بھی اس کو معاف کیا جا سکتا تھا لیکن ایک نقاد ادب کو ایسا تجاہل زیبا نہیں۔ اردو شاعری میں آسی کی شاعری کو شامل نہ کرنا صریح ظلم ہے۔ مانا کہ آسی کے لئے شاعری ننگ تھی لیکن ہمارے لئے تو ننگ نہیں ہے اور پھر آسی کے کلام میں جو سنجیدہ درد مندی اور جو متین گداز ہے وہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بھی مزہ لے کر شعر کہتے تھے اور شاعری کو ننگ و عار کی چیز نہیں سمجھتے تھے۔

سب سے پہلے ان کی مشہور غزل کے دو شعر لیتا ہوں اور انھیں سے اس تبصرہ کا افتتاح کرتا ہوں۔ مطلع ہے:-

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوق غم پیدا ہے
بلبلہ ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے

یہ شعر اگر سوچئے تو شعور محبت کی ایک خاص منزل کا پتہ دیتا ہے جو تصوف کے انفعالی سکون سے آشنا ہی دور ہے جتنا کہ نفسانیت کے اضطراری ہیجان سے۔ شاعر کو وصل اس وقت میسر ہوتا ہے جبکہ وہ ایک پوری عمر وصل کی تمنا میں کھو چکا ہے اور اس کی ایک خاص طبیعت بن چکی ہے۔ مہجوری کا غم سہتے سہتے اس کے اندر ایک ذوق غم پیدا ہو گیا ہے یعنی اب غم اس کا مزاج ہے اور اب اس کو وصل نصیب ہوتا ہے جبکہ وہ وصل سے لذت اندوز ہونے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتا۔ نتیجہ ایک شدید عبرتناک کش مکش Comflict ہے جس کو ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا۔ ایک طرف تو وصل کی نشاط انگیزیاں ہیں دوسری طرف اس ذوق غم کا جواب بمنزلۂ فطرت ہے مطالبہ یہ ہے کہ کسی چیز سے نشاط نہ حاصل کرو اس کش مکش کو شاعر صرف لفظ 'پیدا' سے ادا کرتا ہے اب آپ اس لفظ کی بلاغت کا اندازہ کیجئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے لکھنؤ کے ایک دوست نے جو اردو تنقید نگاری میں کافی روشناس ہو چکے ہیں ایک مرتبہ اسی شعر کو پڑھ کر اعتراض کے لہجہ میں پوچھا تھا 'آخر اس ذوق پیدا کے کیا معنے ہیں' میں نے ان کو بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی کہہ نہیں سکتا کہ وہ سمجھ سکے یا نہیں مگر چپ ضرور ہو گئے۔ خیر اب دوسرے مصرع کی طرف آیئے۔ تشبیہات اور استعارات کی دنیا کا پورا جائزہ لے چکنے کے بعد بھی اس خاص حالت کی مصوری کے لئے اس سے زیادہ صحیح تشبیہہ خیال میں نہیں آتی۔ تشبیہ یا استعارہ جب تک جامع اور مانع نہ ہو فنی اعتبار سے ہم اس کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ یہ بلبلہ کی تشبیہہ جس طرح ہماری اس مخصوص حالت پر محیط ہو گئی ہے شاید کوئی دوسری تشبیہ نہ ہو سکتی۔

یہ کش مکش کوئی ایسی دنیا سے نرالی بات نہیں جو ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ لیکن عام انسان یا تو اس منزل تک پہنچنے کی تاب نہیں لاتا یا اگر پہنچ جاتا ہے تو عموماً اپنی حالت سے بے خبر رہتا ہے۔ شاعر کا کام ہمارے اندر آگاہی پیدا کرنا ہے۔ شاعر اور صوفی میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ صوفی کے لئے اس کے اپنے واردات اور تجربات ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور وہ انھیں میں کھویا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے شاعر اپنے واردات اور تجربات کو اس وقت تک قابل قدر نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ ان کو از سر نو پیدا کر کے دوسروں کے مطلب کی چیز نہ بنا دے۔ صوفی جب خبردار ہوتا ہے تو پھر ہم کو خود اس کی خبر نہیں لگتی۔ شاعر جب خبردار ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو بھی خبردار کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے آسی کے شعر کا یہی اثر ہوتا ہے کہ ہم خود اپنی واقعی یا امکانی حالت سے آگاہ ہو کر اس پر عبور پا جاتے ہیں۔

میں نے سب سے پہلے اس شعر کو اس لئے منتخب کیا کہ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود شاعر کس منزل پر ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں نہ محض صوفی پہنچ سکتا ہے نہ محض شاعر بلکہ صرف وہ شخص پہنچ سکتا ہے جو صوفی اور شاعر دونوں ہو اور جس نے تصوف اور شاعری کو ملا کر ایک آہنگ بنا لیا ہو۔ آسی مجھے مجاز اور حقیقت کا ایک نہایت خوشگوار تصفیہ معلوم ہوتے ہیں ان کی شاعری اس سطح سے ہوتی ہے جہاں مجاز حقیقت اور حقیقت مجاز ہے۔ خود شاعر اپنے اندر اس کا احساس پاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

؎ دنیا میں اٹھا لائیگی فردوس بریں کو
بدمستی صہبا و مزا میر ہماری

یہی وجہ ہے کہ آسی کے حال میں قال کا مزہ ہوتا ہے اور ان کے قال میں حال کا کیف ان کی

شاعری کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار کو ہر سطح کا آدمی حسب توفیق دلنشین پاتا ہے اور ان سے کیف اندوز ہوتا ہے مثال کے طور پر اب وہ دوسرا شعر لیجئے جو اسی غزل کا مقطع ہے جس کے پہلے شعر سے میں نے ابتدا کی تھی۔

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

مجاز میں حقیقت کو دیکھنا ایک بہت پرانی سی رسم ہوگئی ہے۔ یہ کہنے والے دنیا میں بہت ملیں گے۔

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے اک تو ہی صاحب خانہ تھا

لیکن حقیقت کو مجاز کی نت نئی رنگینیوں سے معمور اور پر کیف پانے کے لئے ایک خاص بصیرت درکار ہے مجاز میں حقیقت کا نظر آنا تو پھر بھی دونوں میں ایک محسوس فرق کو باقی رکھتا ہے لیکن حقیقت میں مجاز دیکھنا دراصل دونوں کو ایک محسوس کرنا ہے۔ آسیؔ نے اپنے شعر میں یہی کیا ہے۔ پڑھتے ہی ہر در مس کہدے گا کہ شعر میں حشر، داور حشر اور اپنی گنہگاریوں کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے۔ لیکن شعر کو جو چیز اسی قبیل کے اور سیکڑوں اشعار سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی بلیغ مجازیت Symbolism یا تمثیلیت Allegorsm ہے اور اسی نے اس کو ہر شخص کے حالات اور جذبات سے قریب اور مانوس رکھا ہے شاعر نے عارفانہ وجدانات کو عاشقانہ واردات بنا دیا ہے اور اس کو اپنی اپنی توفیق اور اپنی بصیرت پر چھوڑ دیا ہے کہ داور حشر کو جو جی چاہے سمجھ لو۔ ہمارے لئے اس کی بھی پوری گنجائش کہ ہم اس ہستی کو جزا اور سزا کا مالک سمجھیں جو اس زندگی میں ہمارے دل کا مدعا رہ چکی ہو اور جس نے اس دنیا میں ہماری تمنا کی گستاخیوں اور بیباکیوں کو کبھی نہ بخشا ہے۔ ریاضؔ مرحوم کا ایک شعر ہے۔

رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا
وہی جلوہ آرائے محشر نہ نکلے

ریاضؔ کے تخیل میں جو بات گمان و تذبذب رہ گئی تھی وہ آسیؔ کے مشاہدہ میں آگئی ہے اور عین الیقین ہوگئی ہے۔ داور حشر سے ہم کوئی اجنبیت نہیں محسوس کرتے اس لئے کہ وہ تو ہمارا وہی قدیم محبوب ہے جو اپنی تمام بے وفائیوں کے باوجود زندگی میں ہمارے سارے حرکات و سکنات کا کارفرما رہ چکا ہے اگر آسیؔ فطرتاً شاعر نہ ہوتے اگر وہ محض ایک عارف کامل ہوتے تو ایک ایسے تصور مجرد کی اتنی کامیاب مصوری نہ کر سکتے کہ ہر شخص کو وہ ایک ایسا امکان معلوم ہونے لگے جس کو واقعہ کی صورت اختیار کرتے دیر نہیں لگتی۔

اسی غزل کے بعض اور اشعار سننے کے لائق ہیں۔

آنکھیں تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں دل ترا گرویدہ ہے
جلوہ تیرا دید ہے صورت تیری نادیدہ ہے

انگریزی کے مشہور نقاد ہیزلٹ Hazlitt نے سچ کہا ہے کہ شاعری تخیل اور جذبات کی زبان ہوتی ہے۔" اور میرا خیال ہے کہ اگر منطق یا ریاضیات کو بھی اس زبان میں پیش کیا جائے تو وہ شاعری ہو جائے شاعری اور منطق میں سوا اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ منطق کی زبان اور اس کے تصورات جذبات و تخیل سے ایک قلم عاری ہوتے ہیں۔ بہرکیف ذرا آسیؔ کے اس "تجھکو" کو ملاحظہ کیجئے جس کو ان کی آنکھیں ڈھونڈھتی رہتی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ صوفیوں کا وہی پرانا رسمی معشوق ہوگا جس کو شاہد ازل کہتے ہیں۔ لیکن آسیؔ کے انداز تخاطب میں جو بے تکلفی جو والہانہ سادگی اور جو عاشقانہ وارفتگی پائی جاتی ہے اس نے اس شاہد ازل کو ہر شخص کا محبوب بنا دیا ہے اور ہم آپ سب محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہماری

زندگی میں ایسے تخاطب اور تکلم کا موقع بارہا آچکا ہے۔

دوسرا شعر خالص تصوف اور معرفت کا ہے لیکن اس میں بھی مجاز کی پوری رنگینیاں موجود ہیں اور اس بت پرستی کی لاج رکھ لی گئی ہے جو انسان کی فطرت اصلی ہے۔

۵۔ اتنے تخانوں میں سجدے ایک کعبہ کی عوض
کفر تو اسلام سے بڑھکر تیرا گرویدہ ہے

یہ اس غزل کے اشعار تھے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو اردو شاعری کا صحیح مذاق رکھتا ہے۔

اب قبل اس کے کہ ہم آسی کے اور اشعار کی طرف متوجہ ہوں ان کے متعلق چند اہم رسمی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

آسی کا سلسلۂ تلمذ ناسخ سے ملتا ہے اور جہاں تک شاعری کے اسالیب وصور کا تعلق ہے وہ لکھنوی دبستان کے تربیت یافتہ ہیں چنانچہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کو آج کل کے روشن خیال نقاد محض اردو شاعری کے مزخرافات کہکر الگ کر دیں گے اور جن میں سوائے مناسبات ورعایات کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کہ یہ اشعار صرف زمین اور ردیف وقافیہ بنانے کے لئے کہے گئے ہیں۔ یہ اشعار کچھ شاہ نصیر۔ ذوق۔ ناسخ اور رشک ہی کو زیب دے سکتے تھے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

کہا یہ دیکھ کر خال بت بے پیر کا دانہ
الٰہی اس کو تو کرنا مری تقدیر کا دانہ
جو دانا ہے تو دیوانوں کے قدموں ہی کو تولیگا
مسلسل یہ صدا دیتا ہے ہر زنجیر کا دانہ

گلوئے خشک خواہاں ہر دم تکبیر پانی کا
ذبح سے نہ کر بخل اے دم شمشیر پانی کا
خدنگ آہ نکلا یا کلیجہ ہو گیا پانی
ہوائی تیر سنتے تھے یہ دیکھا تیر پانی کا

آہ بھی آج ہوئی ہم سفر اشک نئی
کیا ملی سوئے فلک رہگذر اشک نئی
آج تو گریۂ عاشق نے کئے دل ٹکڑے
ہاتھ آئے کوئی تیغ اثر اشک نئی
کوشش دست مژہ نے لئے کب روکا تھا
آج ہے طرز گرفت کمر اشک نئی

اس انداز کے اشعار دیوان آسی میں کم نہیں ہیں مگر یہ ان کی شاعری نہیں ہے بلکہ صرف مشق وریاضت ہے۔ جس طرح وہ خانقاہ رشیدیہ کی سجادہ نشینی اور اس کے تمام رسوم وروایات کی پابندی کو اپنی روح کی تہذیب و تحسین کے لئے ضروری سمجھتے تھے اسی طرح انھوں نے اپنے مدرسۂ شاعری کے تمام شرائط ولوازم کو پورا کرنا شاعری کی تکمیل کے لئے اپنا نصاب بنا لیا تھا۔ آسی کے مریدین اُن اشعار کو جو ابھی سنائے گئے ہیں آسی کی ابتدائی مشق بتاتے ہیں اور یہ بہت بڑی حد تک صحیح ہے لیکن ان اشعار کی حقیقت صرف اسی قدر نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ دراصل ان بندشوں اور ضابطوں کی یادگار ہیں جس سے آسی نے اپنے نفس شعری کی تربیت کی ہے۔

آسی نے زبان۔ تشبیہات و استعارات اور دیگر رعایات وہی استعمال کئے ہیں جو روز اول سے ہمارے اردو شعرا استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان روایات قدیمہ میں جو نئی جان ڈالی ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ جو تاثیر آسی نے اپنے کلام میں ان رسوم وتکلفات سے پیدا کی ہے وہ انتہائے خلوص وسادگی کے باوجود بھی کسی دوسرے کو مشکل ہی سے میسر ہو سکتی تھی مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ آسی دبستان ناسخ کے نیر ہیں۔ خود ان کو بھی اس کا احساس ہے مگر آخر اس تاثیر کا راز کیا ہے؟ آسی کی باتیں

اس قدر درد سے لبریز کیوں ہوتی ہیں اور وہ ہم پر چھا کیوں جاتی ہیں؟

آسی کو یہ راز معلوم تھا کہ حقیقت کبھی عریاں ہو کر سطر عام پر نہیں لائی جا سکتی۔ حقیقت سے میری مراد محض معرفت خداوندی نہیں ہے بلکہ ہر وہ حالت ہے جو ہم پر گزرے۔ بہر حال آسی نے تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنائع و بدائع سے وہی کام لیا ہے جو اہل معرفت رموز و علامات سے لیتے ہیں۔ وہ ہر کیفیت اور ہر تاثر کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کر کے سامنے لاتے ہیں کہ ظاہر پرست ان کو محض خرافات شاعری سمجھتے ہیں لیکن اہل بینش کے دلوں پر بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دیکھ لیتے ہیں کہ شاعر دراصل کس حال میں ہے اور اس بناؤ سنگار سے اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

آسی کے لئے یہ تمام رموز و کنایات۔ یہ سارے تشبیہات و استعارات زندہ حقیقتیں ہیں۔ میں یہاں ایک شعر سے اپنا مطلب واضح کرنا چاہتا ہوں اور وہ آسی کے جاننے والوں میں کافی مشہور شعر ہے:-

ع تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ایسوں کی تعداد کافی ہے جو شعر سنتے ہی یہ کہہ دینگے "میاں اس شعر میں رکھا ہی کیا ہے۔ وہی قیامت کا ذکر وہی تاب دیدار کا رونا۔ وہی دقیانوسیت" میں اسلئے یہ کہنے کی جرات کر رہا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جبکہ یوم حالی کے سلسلے میں میں پانی پت جا رہا تھا تو اپنے چند ہم سفر احباب سے اس شعر پر اس قسم کی رائے سنی تھی۔ مجھے بھی اتفاق ہے کہ ہاں سب باتیں وہی ہیں۔ قیامت بھی وہی۔ تاب دیدار بھی وہی۔ لیکن رہی دقیانوسیت کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ شاعر اچھی طرح جانتا ہے کہ دیدار کی تاب لانا دنیا میں سب سے زیادہ سخت اور دشوار کام ہے۔

حضرات ذرا ہم آپ سب اپنی اپنی زندگی پر تبصرہ کر جائیں ہم میں سے کتنے ہیں جن کو اس دیدار سے سابقہ پڑا ہے اور جو اس کی تاب لا سکے ہیں؟ وہ قیس و فرہاد ہوں یا کلیم و منصور اپنی تنگ ظرفی اور بے تابی کی بدولت محبوب کے جلووں کے سامنے شرمندہ سبھی کو ہونا پڑتا ہے یہ شرمندگی انسان کا مقدر معلوم ہوتی ہے۔ آسی کی لغت میں قیامت نام ہے دوسرے روز دیدار کا۔ ان کے لئے قیامت کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ محبوب سے دوبارہ مگر آخری بار ملاقات ہوگی۔ یہ محض خیال نہیں ہے بلکہ آسی کا ایمان ہے۔ حشر کی غایت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ محبوب کا دیدار نصیب ہو۔ اب ذرا سوچئے کہ ایک عاشق نامراد جو زندگی میں اپنی تاب نظارہ سے دھوکا کھا چکا ہو اور صرف اپنے ظرف کے بدولت جلوۂ یار سے محروم رہ گیا ہو اور جس کو ابھی یہ اندیشہ لگا ہو کہ کہیں پھر ایسا ہی نہ ہو سوائے اس کے اور کیا دعا، مانگ سکتا ہے کہ ع

تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا

اور یہ دعا کچھ عجیب قسم کا خلوص اپنے اندر رکھتی ہے جس کا اثر زبان تک میں موجود ہے۔ پیرایۂ اظہار میں جو گداختگی اور جو گھلاوٹ پائی جاتی ہے اس سے غیر شعوری طور پر سننے والے کو اپنی گزری ہوئی حالت یاد آجاتی ہے اور وہ بے اختیار دعا میں آسی کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ سنتے ہیں لب اظہار کا یہ معجزہ کبھی مسیحا کو ملا تھا۔

آسی نے قیامت کے پامال تصور میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے۔ ان کے دیوان میں قیامت کا بار بار ذکر آتا ہے اور جب ذکر آتا ہے تو مخصوص تصور اور مخصوص اعتقاد کے ساتھ۔ قیامت اس دن کا نام ہے جبکہ اس کاروبار عاشقی کی تکمیل ہوگی جو اس زندگی میں نامکمل رہ جاتا ہے۔ اس کو نفسیات کی اصطلاح میں ان داعیات

و ملاقات کی تکمیل کہتے ہیں جو چند در چند اسباب و عوارض کی وجہ سے ہماری روزمرّہ کی زندگی میں پورے نہیں ہو پاتے ہماری ان خوں گشتہ حسرتوں اور ردکردہ تمناؤں کی تکمیل ہمیشہ پردے میں ہوتی ہے۔ ہمارے خواب اس تکمیل آرزو کی ایک خاص صورت ہیں خواب میں ہمارا نفس آزاد و خود مختار رہتا ہے اور محال سے محال آرزو کو آسودہ کر سکتا ہے۔ آسیؔ قیامت اور خواب دونوں کو ایک ہی عنوان کی چیزیں سمجھتے ہیں کہتے ہیں اور کس یقین کے ساتھ کہتے ہیں :-

میری آنکھیں اور دیدار آپ کا
یا قیامت آ گئی یا خواب ہے

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں :-

رو کے آسیؔ پوچھتا تھا کب قیامت آئیگی
کس طرح کہئے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

تمنا اور انتظار کا اس سے زیادہ شدید اور بلیغ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر قیامت کا اس سے زیادہ متعین اور واضح تصور کہاں ملیگا؟ کبھی کبھی آسیؔ کا یقین متزلزل بھی ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن کی کامیابی کی طرف سے بھی وہ کچھ بدگمان اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اس شعر میں :-

وہ کاشش اتنا قیامت میں تو پوچھیں
کہاں ہے آسیؔ بیدل ہمارا

یا یہ شعر :-

وہاں بھی وعدۂ دیدار اس طرح ٹالا
کہ خاص لوگ طلب ہوں گے بار عام کے بعد

مگر اساسی تصور وہی ہے یعنی قیامت اور دیدار کے درمیان ایک ازلی نسبت ہے اور قیامت تو بہت بعد کی چیز ہے آسیؔ اس سے ایک منزل پہلے شب گور کو بھی ملاقات کی رات سمجھتے ہیں۔
کہتے ہیں :-

اب تو چھوٹے نہ سمائینگے کفن میں آسیؔ
ہے شب گور بھی اس گل کی ملاقات کی رات

موت اور بعد الموت کے متعلق آسیؔ کے علاوہ اگر کسی کو ایسا یقین اور اطمینان نصیب تھا تو وہ سقراط ہی تھا۔ اور اگر آسیؔ کا یہ یقین پورا نہ ہوا تو قیامت سے بھی حاصل کچھ نہیں۔

نظر و ناظر و منظور نہ جب ایک ہوئے
کیا ملا روز قیامت میں ندامت کے سوا

پھر قیامت میں بھی وہی ندامت ہوگی جو ایک بار زندگی میں ہو چکی ہے۔ آسیؔ زندگی کو ایک طویل میعاد انتظار و امید قرار دیتے ہیں جو قیامت کے دن پوری ہوگی۔ چنانچہ کہتے ہیں :-

کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روز قیامت والے
جس طرح کٹتی ہے امید ملاقات کی رات

اور اس شعر میں تو نہایت لطیف اور بلیغ کنایہ میں واضح کر دیا ہے کہ بچھڑے ہوئے محبوب سے ملنا اب قیامت ہی میں ہوگا۔

آگلی آسیؔ بنیا ہے کس سے چھوٹا ہے
کہ خط میں روز قیامت لکھا ہے نام کے بعد

اگر قیامت یہی ہے تو اس کو عشاق کی عید سمجھئے۔

قیامت کی اصل غایت تو جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ محبوب کی ملاقات میسر ہو لیکن اس کا بھی اندیشہ ہے کہ ہم مایوس و ناکام رہ جائیں۔ اور قیامت کے دن بھی کچھ نہ ہو سکے اس لئے کہ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی تاب کی شرط لگی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ عین وقت پر ہمارا ظرف پھر ہمارے ساتھ کمی کر جائے۔ اس خیال سے آسیؔ کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں۔

پھر بادۂ تند غصہ پینا ہوگا
پھر ٹکڑے جگر کے ساتھ سینا ہوگا

جینے نے یہاں کے مار ڈالا آسی
سنتے ہیں کہ پھر حشر میں جینا ہوگا

بے ساختہ اس جگہ یقین کا ایک شعر یاد آگیا۔

دوبارہ زندگی کرنا مصیبت اس کو کہتے ہیں
پھر اٹھانا بے دماغوں کا قیامت اس کو کہتے ہیں

لیکن یقین اور آسی میں وہی فرق ہے جو شوریدگی اور پختہ مغزی میں ہوا کرتا ہے۔

بہر حال قیامت کے دن اور کچھ ہو یا نہ ہو اتنا تو ہونا ہی ہے کہ ہماری زندگی کا قضیہ جہاں سے چھوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہوگا۔

خبر جو محشر میں بھیڑ کی ہے وہ حسرتوں کا ہجوم ہوگا
وہ داغ ہوگا کسی کے دل کا جو چمکے گا آفتاب ہو کر

اور حسرتوں کا یہ ہجوم زیادہ تر ہمارے جذبۂ عشق کی نیابت کرے گا اس لئے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی میں جو جذبہ سب سے زیادہ نامکمل اور ناآسودہ رہ جاتا ہے وہ ہمارا جذبۂ عشق ہی ہوتا ہے، ہماری جو تخیل سب سے زیادہ ناقص رہ جاتی ہے وہ محبت کی تخیل ہے اور ہم مجبوراً اس کو قیامت کے دن کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

دور جدید کی مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا ایسے خیالات کی فرسودگی پر قہقہہ لگاتی ہے اس کو نہیں معلوم کہ کسی چیز کی فرسودگی اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہوا کرتی حقیقت جتنا ہی زیادہ پرانی ہوگی اتنا ہی زیادہ سنگین بھی ہوگی۔ حشر و معاد کا تصور انسان کی فطرت میں ہے دنیا میں جتنے مذاہب ظہور پذیر ہوئے ان سب کی بنیاد اسی سوال پر رہی ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ مومن ہو یا منکر۔ ملحد ہو یا صوفی۔ دہریہ ہو یا متکلم اگر وہ اپنے نفس کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے تو معلوم ہوگا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے اندر یہ اندیشہ موجود ہے کہ جب زندگی کی ابتدا یوں ہوئی اور جو یوں نامکمل رہ گئی اس کا موت کے بعد کیا حشر ہوگا۔ ظاہر پرست یورپ جو مادیت اور افادیت کا مبلغ اور علم بردار سمجھا جاتا ہے آج دنیا میں ہر ملک سے زیادہ اس سوال کی طرف متوجہ نظر آتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ آج یورپ میں جن علوم کا سب سے زیادہ چرچا ہے وہ تحلیل نفسی اور تحقیق روحانی ہیں اور یہ دونوں اس باب میں متفق ہیں کہ مرنے کے بعد ہمارے وہ میلانات و رجحانات ابھریں گے جو اس زندگی میں دب کر رہ گئے اور جو علی الاعلان آسودہ نہ کئے جا سکے یہ بھی سب مانتے ہیں کہ ان میلانات میں سب سے زیادہ اہم اور ناقابل تردید وہ ہیں جن کا تعلق ہمارے جذبۂ زوجی یا شعور جنسی سے ہے۔ وہ اس کو شعور جنسی کہتے ہیں ہم اس کو زیادہ لطیف اور رنگین پاتے ہیں اور عشق کہتے ہیں بہر حال یہ مسلم ہے کہ ہمارے وہ جذبات ہماری روح سے چپٹے رہیں گے جو دنیا میں خاطر خواہ آسودہ نہ ہو سکے۔ پھر اگر آسی یہ کہتے ہیں تو کیا غلط ہے۔

غبار ہو کے بھی آسی پھرو گے آوارا
جنون عشق سے ممکن نہیں چھٹکارا

آج کل حیات انسانی کا سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہی ہے اور شاید ہوط آدم سے لیکر اب تک ایسا ہی رہا ہے۔ اب ہم آسی کے دو چار اور اشعار ایسے سناتے ہیں جن کا موضوع موت۔ اور قیامت ہے اور جو ہمارے خیال کی مزید تشریح و توثیق کرتے ہیں۔

فتنہ زار حشر سب سمجھے ہیں جس میدان کو
دامن نازنگہ کا گوشۂ جنبیدہ ہے

ہم سے بے کل سے وعدۂ فردا
بات کرتے ہو تم قیامت کی

اے شب گور وہ بیتابی شب ہائے فراق
آج آرام سے سونا میری تقدیر میں تھا

آل اس کا قیامت ہے قیامت
وہ آفت کی جگہ ہے وارفانی

اب تو دیدار دکھا دیجئے تقصیر معاف
ہو گیا وعدۂ فردا ہی قیامت مجھکو

ساتھ چھوڑا سفر ملک عدم میں سب نے
پہنچی جاتی ہے مگر حسرت دیدار ہنوز

آپ کہتے ہوں گے کہ میں نے صرف ایک عنوان یعنی قیامت پر اتنا وقت لے لیا۔ مجھے خود اس کا اعتراف ہے لیکن میں صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ آسی کی ذات اور ان کی شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ ان کے چند مخصوص اور متعین تصورات و اعتقادات ہیں جن میں آسی کو اسی قدر غلو اور انہماک ہے جس قدر کسی کٹر سے کٹر مذہبی شخص کو اپنے مذہب میں ہو سکتا ہے آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آسی قیامت کا ذکر محض شاعری کی رسم ادا کرنے کے لئے نہیں کرتے! ان کے ذہن میں قیامت کا ایک خاص تصور ہے اور وہ اس کی بابت ایک اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہی آسی کی ساری شاعری ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اور جب کہتے ہیں ایک خاص تصور کے ماتحت، اور ایک شدید اعتقاد کے ساتھ کہتے ہیں جس میں ان کو انہماک ہوتا ہے۔ مثلاً

دل دیا جس نے کسی کو وہ ہوا صاحب دل
ہاتھ آجاتی ہے کھو دینے سے دولت دل کی

یا مثلاً یہ شعر:۔

کوئے محبوب سے کوئی بھی نکل سکتا ہے
اپنے اوہام ہوئے وادیٔ غربت مجھکو

شعر میں تشبیہ سے کام لیا گیا ہے اور تشبیہ بھی ایسی جس کو انوکھی کہنا پڑتا ہے۔ مگر یہ آسی کے تخیل کی شدید ہویت جس نے تشبیہ کو عین واقعہ بنا دیا ہے اور مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہنے دیا ہے۔ "اوہام" کو "وادیٔ غربت" بتانا! اگر کوئی اور کہتا تو ہم اس کو محض شاعری یعنی ایک دور از کار خیال سمجھتے۔ لیکن آسی کا خلوص جذب اور زبان و دل کی یک آہنگی ہے جس نے اس نرالے تخیل کو ہمارے لئے اقلیدس کا ایک ایسا مقالہ بنا دیا ہے جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے۔ ہم سب سنتے ہی مان لیتے ہیں کہ ہمارے "اوہام" ہی ہمارے لئے "وادیٔ غربت" بنے اُردو میں اس قبیل کا صرف ایک شعر مجھے یاد ہے جو میر کے مشہور اشعار میں سے ہے۔

عمر بھر کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

آسی نے ہم کو اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ ہمارے "اوہام" ہم کو کوچۂ دلدار سے نکال بھی سکتے ہیں اور "اسکی دیوار کا سایہ" ہمارے سر سے جا بھی سکتا ہے۔

آسی رمز و کنایہ کے قائل ہیں وہ جانتے ہیں کہ "دشنۂ و خنجر" یا "بادہ و ساغر" کے بغیر گفتگو میں کام نہیں چلتا۔ وہ تشبیہ و استعارہ کو بیان و حقیقت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کہنا شاید زبردستی نہ ہو کہ آسی مجاز کو "قنطرۃ الحقیقت" نہیں بلکہ عین حقیقت مانتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی شاعری میں جو کافی حد تک تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کی شاعری ہے اتنی تاثیر اور لذت نہ ہوتی کہ اس پر "غزل میر" کا اطلاق ہو سکے۔

آسی کے کلام کی مجموعی خصوصیت گستگی اور تبتل ہے یعنی سب کچھ چھوڑ کر محبوب کی طرف نہ صرف آجاؤ بلکہ اسی میں محو ہو جاؤ۔ لیکن یہ محویت کوئی معمولی کیفیت نہیں ہے۔ آسی کے وہاں عشق ایک جداگانہ

مذہب ہو گیا ہے۔ اور ان کی شاعری کو اس مذہب کی
انجیل سمجھنا چاہیئے۔ وہ عشق کی بشارت لے کر آئے
ہیں۔ اور ان کا پیغام یہ ہے کہ بے عشق زندگی بے کیف
ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

یہی معنی ہے وہ دل عاشق معنی جو ہوا
ہائے وہ لوگ جو دلدادۂ صورت بھی نہیں

بیساختہ حافظ کا یہ شعر یاد آ گیا:-

بروز حشر ندانم چہ عذر خواہی گفت
کسے کہ دوست ندارد جمال زیبا را

آتسی نے عشق کو محض ایک وجود بے کیف یا انفعالیت
نہیں سمجھا ہے۔ عشق نام ہے محبوب میں جذب ہو کر یکسر
حرکت و اضطراب ہو جانے کا اور یہ حرکت و اضطراب
کوئی عصبی ہیجان نہیں ہے۔ عشق سے مراد وہ مسلسل
اور پیہم سعی و عمل ہے جس کا تعلق بیک وقت جسم۔
دل۔ دماغ۔ روح غرضکہ انسان کی ساری ہستی سے
ہے۔ عشق اور حسن دونوں لازم ملزوم ہیں اور ایک
دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ دونوں کو مل کر انسان
کے مقدر کی تحسین و تکمیل کرنا ہے۔ اس لئے عشق مجہولیت
اور بے کیفی سے اسی قدر دور ہے جس قدر کہ حسن۔ حسن
اور عشق ایک دوسرے کو کبھی مردہ نہیں ہونے دیتے۔
دونوں ایک دوسرے کے اندر ذوق عمل اور نشاط کار
پیدا کئے رہتے ہیں۔ یہ تین شعر سنئے اور آتسی کے پیغام
کو سمجھنے کی کوشش کیجئے:-

ذوق افزائے جنوں ہے اشتیاق ہم مجھے
دل مراد رکار اس کو اور اس کا غم مجھے
میں وہیں سمجھا لی جب کسوت آدم مجھے
عالم شبنم میں بنایا مرکز عالم مجھے
واقعی صہبائے ذوق جلوہ مستی سوز ہے
وجد میں لاتی ہے آتسی حالت شبنم مجھے

ذرا اس نوید کامرانی کو بھی سنئے:-

ہوا کے رخ تو ذرا آگے بیٹھ جا اے قیس
نسیم صبح نے چھیڑا ہے زلف لیلیٰ کو

آتسی کے دل میں جو دائمی کیف و نشاط موجود ہے
اس کا فیض یہ ہے کہ وہ حسن و عشق کے بازار کو کبھی
سرد نہیں پاتے۔

حسن کی کم نہ ہوئی گرمی بازار ہنوز
نقد جاں تک لئے پھرتے ہیں خریدار ہنوز

آتسی عشق مجازی اور عشق حقیقی کی بحث میں نہیں
پڑتے عشق بہر حال عشق ہے جس میں "درد سر"
نہیں بلکہ "درد دل" اور "درد جگر" درکار ہوتا ہے۔
یہ عشق آخر ہو کس کے ساتھ؟ یہ اپنے اپنے حوصلہ اور
اپنی اپنی توفیق پر منحصر ہے۔ بلجیم کے مشہور صوفی
تمثیل نگار مارس میٹرلنگ کا خیال ہے کہ دنیا
میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے عشق کیا ہو
اور عشق سے اپنی روح کی عظمت اور برگزیدگی میں
اضافہ نہ کیا ہو چاہے اس کا عشق کتنا ہی سفلی کیوں نہ ہو
آتسی نے کھلے الفاظ میں کہیں یہ تلقین نہیں کی ہے
مگر ان کی شاعری کا عام لہجہ اور عام اشارہ یہی ہے کہ
عشق مقصود بالذات ہے جو تمام اضافتوں سے بالاتر
ہے جو کسی کے ساتھ منسوب ہو سکتا ہے جب تک عشق
عشق ہے ہم کو یہ سوال نہ اٹھانا چاہیئے کہ کس کے ساتھ ہے۔

مردم از عشق مراد و جہاں می جستند
صائب از عشق ہماں عشق تمنائی کرد

یہی وجہ ہے کہ ہر پڑھنے والا قطع نظر اس سے کہ وہ
شعور محبت کی کس منزل پر ہے آتسی کی شاعری کو
اپنے سے بہت قریب پاتا ہے اور اس کو ماننا
پڑتا ہے۔

آتسی مست کا کلام سنو
وعظ کیا پند کیا نصیحت کیا؟

مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو مثالیں

ایسی نظر آتی ہیں جنھوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کو کما حقہ تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو "مجازیت" کہا جا سکتا ہے۔ ایک تو حافظ۔ دوسرے آتش۔ درد کے تصوف کی دھوم محض تاریخ شعراردو کی ایک رسم ہے۔ وہ خود کتنے ہی زبردست صوفی کیوں نہ رہے ہوں لیکن شاعری میں ان کا شعور عشق بہت نیچی سطح پر ہے اور وہ معاملۂ عشق میں محض ایک نو آموز معلوم ہوتے ہیں۔ آتش میں تصوف اور تغزل دونوں کے قوی اور شدید امکانات موجود تھے لیکن زمانہ اور ماحول نہ ان کے تصوف کو اچھی طرح نمایاں ہونے دیا نہ تغزل کو۔ آسی کے وہاں تصوف اور تغزل حقیقت اور مجاز دونوں ایک مزاج ہو کر نمایاں ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقت والے اس کو حقیقت سمجھتے ہیں اور مجاز والے مجاز۔ مثال کے طور پر ایک شعر سنئے:-

بس تمہاری طرف سے جو کچھ ہو
میری سعی اور میری ہمت کیا!

فوراً خیال "السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ" کی طرف جاتا ہے۔ لیکن الفاظ میں جو سیدھا پن ہے اور لب و لہجہ میں جو لائٹ اور گداز ہے وہ اس شعر کو عام اور ہمہ گیر بنائے ہوئے ہے۔ ایک دائم الخمر اپنے بازاری محبوب سے بھی یہی کہہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ آشنا ہی خود فراموش ہو اور معیار عشق پر پورا اترتا ہو۔ اور آسی کا معیار عشق کیا ہے؟ وہ بھی سن لیجئے:-

؎ عاشقی میں ہے محویت درکار
راحت وصل و رنج فرقت کیا

اسی غزل کا ایک اور شعر سننے سے تعلق رکھتا ہے:-

؎ نہ گرے اس نگاہ سے کوئی
اور افتاد کیا مصیبت کیا؟

اگر یہ خیال کسی اور شاعر کو سوجھتا جو رعایت لفظی ضروری سمجھتا تو یہ شعر الفاظ کی بازیگری ہو کر رہ جاتا اور اس میں کوئی تاثیر نہ ہوتی۔ لیکن جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ آسی کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ تمام آرائش اور تکلف کے باوجود اپنے کمال کو اس تاثیر سے بھر دیتے ہیں جو خلوص اور سادگی سے پیدا ہوتی ہے تشبیہات و استعارات کی شاعری دنیا میں بہت کم تاثیر کی شاعری ہو سکی ہے۔ مگر آسی کے دل میں کیفیت پہلے پیدا ہوتی ہے اور تشبیہات و استعارات اور دوسرے مناسبات بعد کو سوجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے تشبیہات و استعارات بھی ان کے جذبات و تاثرات کے لازمی عناصر بن جاتے ہیں۔ اور صورت و معنی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا جو شعر ابھی سنایا گیا ہے اس پر غور کیجئے۔ ظاہر ہے کہ "گرنا" اور "افتاد" میں رعایت ملحوظ ہے۔ لیکن شاعر خود اس قدر متاثر ہے اور اس رعایت کی واقعیت کو اس شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے کہ آج ہر سننے والے کو اس کی واقعیت ایک نہایت عام بات معلوم ہو رہی ہے۔ لفظ اور معنی کو ایک کر دینا اس کو کہتے ہیں۔ "گرنے" کے لغوی معنی "گرنے" کے استعارتی معنی "نگاہ سے گرنے" کا محاورہ "افتاد" اور "مصیبت" سب ایک ہی حالت کے مختلف نام ہیں:-

اس غزل کے دو اشعار اور سن لیجئے:-

؎ جن میں چرچا نہ کچھ تمہارا ہو
ایسے احباب ایسی صحبت کیا
جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں
ہجر میں زندگی کی مدت کیا

آسی کی ہر بات ہمارے دل میں تیر کی طرح اتر جاتی ہے اس لئے کہ وہ حال اور بیان حال میں کوئی فرق باقی نہیں رہنے دیتے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

جو رہی اور کوئی دم یہی حالت دل کی
آج ہے پہلوئے غمناک سے رخصت دل کی

اگر کبھی بھی آپ کے دل کی یہ حالت رہ چکی ہے تو اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس حالت کو بیان کیسے کرتے ہیں۔ کسی قدیم مشرقی نقاد سخن کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ اصلی شعر وہ ہے کہ ہر سننے والا سمجھے کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا تھا لیکن جب کہنے بیٹھے تو معلوم ہو کہ واقعی اس کے لئے کس دلسوزی اور جگر خراشی کی ضرورت ہے۔ آسی کا یہ شعر ایسا ہی ہے۔ اس غزل کے تین شعر اور پیش کرنا چاہتا ہوں:۔

کوچۂ یار سے گھبرا کے نکلنا کیا تھا
دل کو شکوے ہیں مرے مجھکو شکایت دل کی

اگر آپ کو زندگی میں کبھی بھی "کوچۂ یار" سے سابقہ رہا ہے اور اگر آپ کے اندر حمیت عشق کا کچھ بھی اثر باقی ہے تو آپ کے دل کو آپ سے اور آپ کو اپنے دل سے یہی شکایت ہوگی۔

اس شعر میں وحشت دل کا کیا بے تکلف اور بے ریا نقشہ کھینچا گیا:۔

گھر چھٹا شہر چھٹا کوچۂ دلدار چھٹا
کوہ و صحرا میں لئے پھرتی ہے وحشت دل کی

مقطع میں جس تسلیم و رضا کی ترغیب دی گئی ہے وہ منتہائے عشق ہے اور ہر عاشق کے مقدر کی چیز نہیں ہے:۔

راستہ چھوڑ دیا اس نے ادھر کا آسی
کیوں بنی رہگذر یار میں تربت دل کی

آسی کے کلام کے مطالعہ کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ کامیاب ادب میں لفظ اور معنی کے درمیان کوئی دوئی نہیں رہتی۔ لفظ ہی معنی اور معنی ہی لفظ ہوتا ہے۔ شاعر کا کام نہ صرف یہ ہے کہ معنی کے لئے لفظ تلاش کرے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ لفظ کے معنوی کیفیت کو بڑھا دے۔ مسیح کا معجزہ کچھ اس سے زیادہ نہ تھا۔ الفاظ وہی تھے جو لغت میں صدیوں سے موجود تھے۔ صرف ان کی معنوی کیفیت اور معنوی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مردوں میں بھی جان پڑ جاتی تھی۔ آسی نے اپنے بہترین اشعار میں یہی کیا ہے۔ وہ فرسودہ سے فرسودہ لفظ کو ایسے وقت اور ایسی ترکیب کے ساتھ لاتے ہیں اور اس کے اندر ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ لفظ ہمارے لئے بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ اس وقت مجھے ان کی ایک رباعی یاد آرہی ہے۔

غنچے! تجھے میری دلفگاری کی قسم
شبنم! تجھے میری اشکباری کی قسم
کس گل کی نسیم صبح خوشبو لائی
بیتاب ہے دل جناب باری کی قسم

ذرا اس "جناب باری" پر غور کیجئے گا۔ کس قدر عام اور پرانی اصطلاح ہے لیکن آسی نے جیسا کہ اسکو نئے معنوی کیفیت سے بھر دیا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر آخر میں یہ قسم نہ کھائی گئی ہوتی تو نہ شاعر اس حالت کو پوری طرح بیان کر سکتا اور نہ ہم خاطر خواہ اس سے متاثر ہو پاتے شاعر کی زبان قسم کی تہذیب و تحسین کرتی چلی گئی ہے یہانتک کہ اس کی قسم اس کی حالت پر محیط ہو گئی ہے۔

چند خالص استعاری انداز کے اشعار سنئے جن میں صرف استعارہ سے کیف و جذب پیدا کیا گیا ہے۔

؎ ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لطفِ غبارِ پسِ محمل دینا

کیا اس شعر نے "غبارِ پسِ محمل" کو ہمارے لئے ایک جاندار حقیقت نہیں بنا دی ہے ؟

یا یہ شعر :-

ذوق میں صورتِ موج آکے فنا ہو جاؤں گا
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

اگر استعارہ اس قدر کامل ہو اور اس میں ایسی لازمیت پائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں تاثیر نہ ہو۔ استعارہ اس وقت بے اثر ہوتا ہے جبکہ وہ ہمارے کسی خیال یا جذبہ پر حاوی نہ ہو سکے۔ آسی کا ہر استعارہ اضطراری ہوتا ہے اور اس میں آورد کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے جو سیدھے سادے ہیں اور جن کی تاثیر کا راز ان کی سادگی اور معصومیت میں ہے۔

مثلاً اسی غزل کے یہ دو شعر :-

؎ اے رے اے تیری عقدہ کشائی کے مزے
تو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

یا یہ غزل :-

پسند آئے تو لے لو دل ہمارا
مگر پھر دل بھی کس قابل ہمارا

چھری بھی تیز ظالم نے نہ کر لی
بڑا بے رحم تھا قاتل ہمارا

نہیں ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھ دیں
تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا

نہ آنا ہم تمہارا دیکھ لیں گے
جو نکلا جذبِ دل کامل ہمارا

لیکن اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے۔

دلِ گردوں سے لیکر تا دلِ دوست
گیا نالہ کہی منزل ہمارا

ہم ان تمام منزلوں کو احاطہ کرنے سے قاصر ہیں جو ہمارے دل سے دلِ گردوں تک اور پھر دلِ گردوں سے دلِ دوست تک حائل ہیں اور جن کو ہمارا شاعر اس سہولت کے ساتھ بات کی بات میں طے کر گیا ہے اس کے لئے جس کائناتی بصیرت Casmic اور جس مافوق تخیل Transundented Imagination کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کے نصیب کی چیز نہیں۔

آسی کی شاعری اس بات کا پورا پتہ دیتی ہے کہ وہ صاحبِ کیف وحال تھے۔ اور یہ کیف وحال صوفیانہ سے کہیں زیادہ عاشقانہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ آسی کے تجربہ میں کیف وحال کی یہ تقسیم تھی ہی نہیں۔ ان کا ہر شعر ایک وجد ہوتا ہے اور اس مقام کی خبر دیتا ہے جہاں خارجی اور داخلی میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا جہاں گرد وپیش کی ہر حالت ایک کیفِ باطن ہو جاتی ہے جہاں محبت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور "نظر و ناظر و منظور" سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں آسی چونکہ زندگی اور محبت کے تمام درمیانی اور ادنیٰ مراحل ومنازل طے کر کے اس منزل پر پہنچے ہیں اور جن جن صعوبتوں اور مشقتوں سے ان کو دوچار ہونا پڑا ہے ان کو بھولے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی ماہیت اور اہمیت کے اب بھی قائل ہیں۔ اس لئے جب وہ کوئی بات کہتے ہیں تو اس میں ان مرحلوں اور صعوبتوں کی بھی پوری جھلک ہوتی ہے لیکن وہ بات ہوتی ہے ان کی اپنی منزل سے۔ اسی لئے ان کی شاعری ہمارے اندر کسی قسم کی دوری یا اجنبیت کا احساس پیدا کئے ہوئے بغیر ہم کو غیر شعوری طور پر رفعت وتمکین کے احساس سے معمور کرتی رہتی ہے۔

آسی کے کلام سے ہمارے اندر کبھی افسردگی یا بیدلی
نہیں پیدا ہوتی۔ جیسا کہ بعض دوسرے متغزلین کے مطالعہ
سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا سوز و گداز ہمارے دل میں
جینے کی ایک نئی تاب پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی دردمندی
میں نشاط کا ایک پہلو ہوتا ہے جو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ محبت
کے غم کو زندگی کی اپج بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے
کلام میں وہ اثر ہے جو تیر کی خاص شان ہے۔ ایک غزل
کے کچھ اشعار سنئے :-

اسی کے جلوے تھے لیکن وصال یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا
خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا
غلط ہے حکم جہنم کسے ہوا ہو گا
کہ مجھ سے بڑھ کے تو کوئی گناہگار نہ تھا
وفور بے خودیٔ بزم سے نہ پوچھو رات
کوئی بجز نگہ یار ہوشیار نہ تھا
لحد کو کھول کے دیکھو تو اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا
تو محو گلبن و گلزار ہو گیا آسی
تری نظر میں جمال خیال یار نہ تھا

آج تک میری نظر سے غالب کے علاوہ اردو
میں کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس کی ایک ایک غزل میں
اتنے اشعار قابل انتخاب نکل آتے ہوں اور اگر آپ
لوگ انصاف کریں تو میرے اس انتخاب کو جوش عقیدت
سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے شعر میں وصل کا جو بلند اور
ناقابل حصول تصور پیش کیا گیا ہے اور جس طرح یہ ذہن
نشین کیا گیا ہے کہ تڑپتے رہنا عاشق کا فطری منصب
ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ملیگی۔ دوسرے شعر
میں ذوات و اعیان اور مظاہر و حوادث میں جو ازلی تعلق
ہے اس کو جس حسن اسلوب کے ساتھ واضح کیا گیا ہے وہ
نہایت دلپذیر ہے۔ تیسرے شعر میں جس اعتماد اور جس
اطمینان کے ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف
کیا گیا ہے وہ ان کمزوریوں اور خامیوں کو سراسر توانائی
اور پختگی بنائے ہوئے ہے اس کے بعد کے دو شعر
ایسا تیر کی طرح دل میں بیٹھ جاتے ہیں کہ شاید ہی کوئی نقاد
سخن ان کو انتخاب سے خارج کرنا گوارا کرے بمقطع
میں استغراق کی جو نئی تخیل ہے اور جس حسن کے ساتھ
بیان کی گئی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ شاعر "جمال یار"
کے جمال میں نہیں بلکہ "خیال یار" کے جمال میں محو ہو جانے
کی تحریک کر رہا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے اور وہ ادھر
مظاہر میں بہل جاتے ہیں ان کو مورد طعن سمجھتا ہے۔
اگر محض فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی آسی
کو ایک قادر الکلام شاعر ماننا پڑتا ہے۔ اسلوب اور زبان
میں بھی ان کا ایک مرتبہ ہے۔ اگر وہ اثر و تاثیر میں متقدمین
سے آنکھیں ملا سکتے ہیں تو زبان اور رعایات و تکلفات
میں متاخرین سے بھی جو بھر کم نہیں ہیں اور پھر اس امتزاج
کو انھوں نے کس قدر حسین اور دلفریب بنا دیا ہے اب
آخر میں ان کی غزلوں سے ہر قسم کے اشعار منتخب کر کے
سناتا ہوں تاکہ آسی کے متعلق جتنی باتیں کہی گئی ہیں
ان کی خاطر خواہ تشریح و تائید ہو سکے۔

وفا دشمن ہو تم یا ہو جفا دوست
بہر صورت مجھے رہنا رضا دوست
کوئی دشمن ہو یا آسی مرا دوست
میں سب کا دوست کیا دشمن ہو کیا دوست
ترقی اور تنزل کی نہ پوچھو ...
میں دشمن ہو گیا دشمن ہوا دوست
مجھے نیرنگ دل نے مار ڈالا
یہ دشمن کا ہے دشمن دوست کا دوست
فریب عالم صورت سے بچنا
نہیں کوئی کسی کا جز خدا دوست

فقیروں کا بنا لو بھیس آتی
وہ شاہنشاہِ خوباں ہے گدا دوست

عشق میں کہتے ہیں کا بل آتی دگیر تھا
آہ جس کی بے اثر تھی نالہ بے تاثیر تھا
حالتِ دل خاک میں کہتا کہ تا ہنگامِ مرگ
آپ کا شکرِ جفا یا شکوۂ تقدیر تھا
عشق نے فرہاد کے پردے میں پایا انتقام
ایک مدت سے ہمارا خون دامنگیر تھا
وہ مصور تھا کوئی یا آپ کا حسنِ شباب
جس نے صورت دیکھ لی اک پیکرِ تصویر تھا

نقشِ دو جہاں گردشِ پیمانۂ دل تھا
کُن روزِ ازل نعرۂ مستانۂ دل تھا
خوشبو وہی رنگت وہی مستی بھی اسی کی
کعبہ میں بھی دورِ مئے میخانۂ دل تھا
ذوقِ غم واندوہ محبت کے میں صدقے
جو داغ دیا تم نے وہ جانانۂ دل تھا

آئینہ آپ کے نزدیک جو نامحرم ہے
آپ نے خاک نہ جانا کہ مجھے کیا غم ہے
عشق کہتا ہے دو عالم سے جدا ہو جانا
حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے
میرے دشمن کو نہ مجھ پر کبھی قابو دینا
تم نے منہ پھیر لیا آہ یہی کیا کم ہے
ایک عالم کے طلسمات میں جی چھوٹ گیا
ہر ادائے نگہ ناز نیا عالم ہے

قطرہ میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہیے
بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہیے

لالہ و گل میں اسی رشکِ چمن کی ہے بہار
باغ میں کون ہے اے بادِ صبا کیا کہیے
ایک ہستی کے سوا ہم نے نہ جانا کچھ بھی
اے نکیرین اب اور اس کے سوا کیا کہیے

بہر صورت طلب لازم آبِ زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو نہ پایا تو سکندر ہو
کوئی تو پی کے نکلیگا اڑیگی کچھ تو بو منہ سے
درِ پیر مغاں پر مے پرستو چل کے بستر ہو
کسی کے در پہ آسی رات رو رو کر یہ کہتا تھا
کہ آخر میں تمہارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

ایک جلوے کی ہوس وہ دمِ رحلت بھی نہیں
کچھ محبت نہیں ظالم تو مروت بھی نہیں
جو دیا تو نے تری راہ میں سب کھو بیٹھے
ہاں اگر شکر نہیں ہے تو شکایت بھی نہیں

ٹکڑے ہو کر جو ملی کوہکن و مجنوں کو
کہیں میری ہی وہ پھوٹی ہوئی تقدیر نہ ہو
وہ بھی کچھ عشق ہے جو درد کی لذت نہ چکھے
وہ بھی نالہ ہے جو حسرت کش تاثیر نہ ہو
جس کو دیکھا اسے چھاتی سے لگائے دیکھا
دل جسے کہتی ہے خلقت تری تصویر نہ ہو
حاصلِ صحبتِ غمناک بجز غم کیا ہے
دل مرا لیتے ہو ڈرتا ہوں کہ دلگیر نہ ہو
صاف دیکھا ہے کہ غنچوں نے لہو تھوکا ہو
موسمِ گل میں الٰہی کوئی دلگیر نہ ہو

سوئے دشت ایک قدم ایک ترے گھر کی طرف
سر میں سودا ہے تو ملنے کی تمنا دل میں

داغوں میں روشنی شمع سحر طور رہے آج
کون ہے اے شب غم انجمن آرا دل میں

کس دشت میں عشق نے تھکایا
ہر ایک رواں ہے کارواں سوز
اس خلوت راز کے طلسمات
جو راز کھلا وہ راز داں سوز

یہ دونوں ایک ہی ترکش کے تین تیر
محبت اور مرگ ناگہاں
علم کر خلد میں بھی خنجر ناز
تصدق ہے حیات جاودانی

جو یہ کہہ ہے کوئی بلبل کی صورت نعرہ زن کیوں ہو
کوئی گلفام کیوں ہو گلبدن گل پیرہن کیوں ہو
تمھیں سچ سچ بتا دو کون تھا شیریں کی صورت میں
کہ مشت خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

اس کا بھی تو اب پتہ نہیں ہے
لائے تھے یہاں دل حزیں ہم

کون اس گھاٹ سے اترا کہ جناب آسی
بوسہ لینے کو بڑھے ہیں لب ساحل کی طرف

دل جس سے مل گیا وہی نکلا بجائے دل
یا یوں کہو کہ کچھ بھی نہیں ہے سوائے دل

جنبش بھی کبھی اپنے ارادہ سے نہ کرنا
چلتے ہیں تو چلاتی ہے زنجیر ہماری

رات ہے رات تو بس مرد خوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوق مناجات کی رات

کی نہ جوش جنوں میں نہ پاؤں میں طاقت
کوئی نہیں جو اٹھا لا دے گھر میں صحرا کو

نہ مرض کچھ ہے نہ آسیب نہ سایا ہم کو
اک پریزاد نے دیوانہ بنایا ہم کو

آج وہ ہیں مجمع احباب ہے
ایک مہجور آسی بے تاب ہے

اور کیا چاہتی ہے آرزوئے دل ان سے
کچھ نہیں حسن کی سرکار میں حسرت کے سوا

یہ ہے آسی کے کلام سے انتخاب۔ میں نے اول اول دو سو سے زائد اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن پھر بیشتر ایسے اشعار کو نکال کر انتخاب کو مختصر کر دیا جو کافی مشہور و معروف ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی غزل گوئی آسی کا حاصل عمر ہے اس لئے کہ اردو شاعری میں جو چیز ان کو ہمیشہ زندہ رکھیگی وہ ان کی غزل ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے نمایاں شان ان کی غزلیت ہے جو ان کی رباعیوں میں بھی موجود ہے۔ رباعی کی صنف میں بھی آسی کا ایک مرتبہ ہے۔ دو رباعیاں سنا چکا ہوں۔ چند اور سنیئے:-

یا مجھکو ترا حسن نہ بھایا ہوتا
یا ہر رگ و پے میں تو سمایا ہوتا
یا دل ہی میں جلوہ گر اگر ہونا تھا
ہر جزو بدن کو دل بنایا ہوتا

کب تک کوئی اپنے دل کے غم کو روئے
کب تک کوئی یار کے ستم کو روئے
ہر دم یہ دعا رہی ہے الفت جس کی
اللہ کرے کہ اب وہ ہم کو روئے

جن سے رہ و رسم کی وہ رہزن نکلے
بھولا جنھیں سمجھے تھے وہ پُرفن نکلے
جان اپنی جن احباب کو ہم سمجھے آہ!
وہ دل کی طرح ہمارے دشمن نکلے

جس کی طبیعت میں یہ گداز اور جس کی زبان میں یہ نرمی ہو وہ کسی اور صنفِ سخن کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا شاید عشقیہ مثنوی میں بھی آسی کامیاب رہتے لیکن جس جذب و حال کے عالم میں وہ رہا کرتے تھے وہ مسلسل گوئی کے منافی تھا۔ اسی لئے انھوں نے غزل اور رباعی کے سوا کسی اور صنف کی طرف توجہ نہیں کی۔ دو قصیدے کہے ہیں جن میں ایک تو نواب کلب علی خاں والئی رامپور کی شان میں ہے اور مکمل ہے دوسرا میر محبوب علی خاں نظام دکن کی مدح میں ہے اور ناتمام ہے۔ ان قصیدوں میں فن کے اعتبار سے کوئی بات قابل لحاظ نہیں ہے۔ البتہ تشبیب دونوں قصیدوں کی خوب ہیں اور خالص غزل کا حکم رکھتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کہاں ترا کوئی بحرِ وجود میں ثانی
حباب دیدۂ اہل نظر میں ہے پانی
کہے بہار لبِ گل سے میں بہار تو کیا
یہ شورِ کشتنِ منصور وائے نادانی
اگر یہ میں ہوں تو کیا تیری ذات ہے محدود
اگر یہ تو ہے تو پھر کیا وجودِ امکانی

دوسرا قصیدہ یہ ہے:۔

کسی کو دیکھ کے لغزش جو پاؤں میں آئی
شراب پی کر وہ آنکھیں نہ ہوں کہیں بدنام
بس اتنے پر کہ لبِ لعلِ یار چوم لیا
مرے فرشتہ نے لکھا ہے مجھ کو مے آشام
کوئی کہے مجھے دیوانہ کوئی سودائی
تمھارے عشق نے کیا کیا کیا مجھے بدنام
کسی طرح کسی قالب میں انقلاب تو ہو
خدا کرے کہ جدائی ہو داخلِ ایام

حضرات آپ لوگوں کو شاید یہ شکایت ہو کہ میں نے خواہ مخواہ اتنا لمبا انتخاب پیش کرکے بات کو ضرورت سے زیادہ طول دیدیا جو محض میرے جذبۂ عقیدت اور بڑھے ہوئے حسن ظن کی دلیل ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تنقید بھی ادب ہی کی ایک صنف ہے اور لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور اس کے اپنے جذبات سے کبھی الگ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یقین مانئے میرا اصل مقصد یہ تھا کہ خود آپ کو بھی فیصلہ کرنے میں سہولت ہو اور آپ خود تسلیم کرلیں کہ جس شاعر کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہو اس کی شاعری کو تاریخ میں داخل نہ کرنا یا تو تصوف کا ایک غلط زعم اور بیجا رتبہ شناسی ہے یا پھر محض بدذوقی اور بے بصری۔ اب آخر میں ہم چند اور اشعار سنا کر اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں سے رخصت چاہتا ہوں۔

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو ؛ چشم بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز
کیا خرابا تیوں کو حضرت آسی نہ ملے
کہ سلامت ہے وہی جبہ و دستار ہنوز
انھیں کانوں سے انا الحق کے سنے ہیں نعرے
آدمی عشق میں کیا جانئے کیا ہوتا ہے
ملنے کی ہی راہ نہ ملنے کی بھی راہ
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہگذر ہے
اب کہیں آسی نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہوئے کنگرۂ عرش ہلانے والے
بکہ گوئی روزِ ازل پیر خرابات کے تھے ؛ ہم ہوئے تم ہوئے یا آسی میخوار ہوا

صمد ساز رضوی

چہرہ منوّر، مہر درخشاں — عارضِ روشن، ماہِ تاباں

برق نگاہیں، تارے آنکھیں — کاکُل پریشاں، ابرِ بہاراں

آواز لبریز موسیقیوں سے — رہزنِ دل مضرابِ رگِ جاں

ہر قہقہہ گویا قلقلِ مینا — ہر مسکراہٹ صبحِ خنداں

رنگین پیکر، حسن شرابی — تخیُّلِ فطرت تحصیلِ امکاں

جانِ ملاحت، کانِ صباحت — از سرتاپا روحِ گلستاں

مستی سراپا، شعر مجسّم — حسنِ مکمل، شاعر کا ارماں

اے سازؔ وہ دشمنِ ہوش آیا

مستانہ لغزش، رقصاں خنداں

شیر محمد اختر

بھگوان اور بیل

" پھر وہی بھگوان ——"
" ناتھ! آپ آ گئے —— میرے بھگوان
تو نے میری سن لی "
" اب تیرے سوا —— تیرے سوا کون مرا کرشن کنیا "
" بھگوان کنارے سے لگا دے میری نیا "

پریم سروپ بیوی کی نقل اتارنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ پاربتی —— اس کی بیوی کرشن مورتی کے سامنے بیٹھی پوجا کر رہی تھی۔ پریم سروپ اور اس میں کتنا فرق تھا۔ اُن کی شادی کو چند سال ہی ہوئے تھے کہ پریم سروپ گھر سے باہر رہنے لگا۔ گھر میں آکر اسے ایسا معلوم ہوتا گویا وہ کسی اُجڑی بستی میں آ گیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا گھر ایک آئیڈیل گھر ہو۔ وہ آئیڈیل جو اس نے سینما دیکھ کر تیار کیا تھا۔ وہ زندگی کو ہیرو بن کر بسر کرنے کا خواہشمند تھا اور پاربتی کو وہ ہیروئن بنانا چاہتا تھا۔ مگر پاربتی ہیروئن بننا پسند نہ کرتی تھی۔ اس کے لئے پتی کی سیوا ہی دھرم تھا۔ مگر سروپ کو دھرم کے نام سے چڑ تھی۔

سروپ نے ایک برس اس متضاد احول کا مقابلہ کیا۔ اُسے بیوی سے محبت تھی۔ مگر وہ محبت جس کا وہ خواہشمند تھا۔ اُسے نہ مل سکی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہیرو کی طرح اپنی محبوبہ کو وہ دبائے دبوچے۔ اس سے کھل کھیلے گھر کے کمرے فلم کے سین بن جائیں۔ دن عید اور رات شب برات ہو۔ مگر پاربتی کو سروپ کی ان حرکات سے شرم آتی تھی۔ وہ پوجا پاٹ کرتی۔ گھر بار کا کام کاج کرتی۔ اور پھر سب سے زیادہ اسے اپنے پتی کی خدمت میں چین میسر آتا وہ پریم کی پوجا کرتی۔ مگر یہی پوجا پریم کو اور زیادہ چڑاتی۔

دونوں مخالف سمتوں میں جا رہے تھے۔ ایک کے لئے دھرم میں ہی سب کچھ تھا۔ مگر دوسرا دھرم کے نام سے چڑ جاتا۔ ایک دکھ کو سکھ جان کر برداشت کرتا گیا۔ مگر دوسرا زیادہ دکھ دیتا۔ شاید اس سے پاربتی اپنے خاوند کو سمجھ سکے۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ خاوند پریشان ہو کر گھر سے باہر رہنے لگا۔ پاربتی اس کو منانے کے لئے بھگوان کو تنگ کرتی۔ سارا سارا دن اور رات وہ پوجا میں مصروف رہتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسی میں دھرم ہے۔ مگر پتی دیوتا کچھ اور چاہتا تھا اسے پجارن کی بجائے ایک حسین بیوی کی ضرورت تھی۔ ایسی بیوی جو اس کے جذبات کو بیدار کر سکے۔ جو اس کا ساتھی ہو۔ جو اس کے خیالات کی تعریف کر سکے۔

مگر . . . . پاربتی نہ سمجھ سکی۔ پریم سروپ جب بھی آتا۔ شراب سے چور رہتا۔ آج وہ کئی دنوں کے بعد گھر آیا تھا۔ عین اسی وقت جب وہ دعا مانگ رہی تھی۔

اب تیرے سوا کون میرا کرشن کنیا
بھگوان کنارے سے لگا دے میری نیا

اور جب اس نے وہی الفاظ دہرائے تو ان میں کتنی طنز تھی۔ اس نے سامنے سونے کا کرشن کا بت دیکھا۔ یہ بت پاربتی میکے سے لائی تھی۔ اس کا رکھوالا

بھگوان ــــ پریم سروپ کو باپ سے ورثہ میں الحاد ملا تھا۔ وہ ایک برہمن کا بیٹا تھا۔ اس نے دھرم کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بھگوان کے نام سے اسے نفرت تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس نام سے کیسے لوٹا جاتا ہے۔ اور وہ لوگ کتنے سادہ ہوتے ہیں جو لٹ جاتے ہیں" پارو ..... ادھر آؤ ..... ادھر" وہ جھوم گیا" ارے ادھر آؤ .....
یہ دیکھو تمہارے لئے کیا لایا ہوں .. تحفے ....."
ناتھ .... " پاربتی نے اس کے قدم چھوئے
وہ تحفہ کا لفظ سن کر ہی ذرا مسرت سے سرخ ہو گئی۔
" ہاں پارو تحفے ..... وہ بنڈل کھولو ....."

پاربتی خوش تھی۔ بھگوان نے اس کی پرارتھنا سن لی۔ اس کا پتی گھر آگیا تھا۔ اور وہ اس کے لئے تحفے لایا تھا۔ وہ خوشی سے ناچ اٹھی۔ ایک مست ہرنی کی طرح وہ اٹھی۔ پریم کو سنبھالا اور اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔
وہ ابھی تک اپنا فقرہ دہرا رہا تھا ....." پارو .... وہ بنڈل ..... ہاں ہاں وہی ....
لاؤ ..... مجھے دو ....." پریم نے کانپتے ہاتھوں سے بنڈل کھولا۔ اس میں سے پلاسٹر کا ایک مجسمہ نکلا۔ یہ کرشن بھگوان کا مجسمہ تھا۔ چھوٹا سا خوبصورت اور سفید سا مجسمہ۔ پاربتی کو تو گویا ساری کائنات مل گئی۔ اس نے بیتابی سے بڑھکر وہ مجسمہ چھیننا چاہا۔
" میرے کرشن مراری " اس کے لب ہل رہے تھے۔ اشتیاق اور تقدس کے جذبات اس کے چہرے پر ایک نکھار پیدا کر گئے۔
" ہاں پارو ..... یہ تیرے کرشن مراری ہی ہیں ....."
" ناتھ .. ... " وہ رک گئی۔ وہ اظہار شکریہ کے لئے الفاظ نہ پا رہی تھی۔ پریم سروپ جسے بھگوان کے نام سے بھی ضد تھی۔ وہ آج خود کرشن کی مورتی لیکر آیا تھا اپنی پاربتی کے لئے۔ یہ سب بھگوان کا کرشمہ تھا۔ اس کے بھگوان کا کرشمہ۔ اس نے پریم کا دل پھیر دیا تھا۔
" پارو ..... یہ تو رہا تیرا بھگوان اب ذرا دوسرے پیکٹ کھولنا ....
ہاں ہاں مہاتما گاندھی ..... ابو الکلام آزاد ..... یہ بیل ہے ..... "
پاربتی حیران ہو گئی۔ کرشن بھگوان۔ گاندھی جی۔ ابو الکلام آزاد۔ اور یہ بیل۔ آخر بیل کا کیا مطلب تھا۔ اور یہ مجسمے لانے کا فائدہ۔ پینے کا اثر دماغ پر ہو گیا ہوگا۔ تبھی بہک کر جو کچھ ملا۔ اٹھا لائے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کھلونے پلنگ پر رکھے تھے" تم بھی آؤ ..... " اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ....
" پارو! پارو! آؤ آؤ۔ حیران کھڑی ہو۔ ارے کیوں ..... ؟ میں پگلا ہوں ..... اور میرا منہ کیوں تک رہی ہو ... یہ تیرے کرشن اور گاندھی اور یہ میرے ابو الکلام آزاد ....
پارو میں آج جا رہا تھا ..... کہیں (تمہیں کیا اس سے) اکڑ یہ۔ ارے یہی ہا ہے بازار کی نکڑ پر ..... یہ کھلونے رکھے تھے۔ میں نے خرید لئے" اس نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ پاربتی کا سارا جسم کانپ گیا۔ اس کا قہقہہ کتنا خوفناک تھا۔ اس نے کرشن کا مجسمہ اٹھایا" یہ ۱۲ کا ہے۔ بارہ آنے ہا! ہا! ہا! اور تیرے گاندھی جی دس آنے!!!!!!
میرے ابو الکلام آزاد ہا! ہا! ہا! جانتی ہو مجھے کیوں پیارے ہیں۔ وہ آزادئ وطن کے حامی ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے رہنما ..... اری میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا حامی ہوں۔ جس ہندستان میں وہ بستے ہیں وہاں ہندو مسلم فساد ہوتے ہیں۔ گر میرے ہندستان

میں فساد نہیں ہوتے۔ مسلمان اپنے گلاس میں مجھے پلاتا ہے۔ پریم کا رس .... اور میں اسے پلاتا ہوں محبت کی شراب .... رس .... شراب۔ میں ہندو مسلم اتحاد کا حامی .... ارے اس دوکاندار نے مجھ سے، میرے محبوب لیڈر کے صرف آٹھ آنے مانگے .... آٹھ آنے ....

ہا! ہا! ہا! اور یہ بیل ...... اس کے دو روپے.. ..... دو روپے ......" اس کے چہرے پر عجیب کیفیت تھی۔

"——میں نے جانا وہ لگا ہے۔ اس نے پی ہوئی ہے۔ میں نے کہا دوست۔ بھگوان مہاراج، مہاتما گاندھی اور ابو الکلام آزاد آنوں میں بیچتے ہو۔ اور یہ بیل —— جانور دو روپے میں —— اور پارو! جانتی ہو اس نے کیا جواب دیا۔ ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ بابو جی: کرشن مہاراج —— مہاتما گاندھی اور مولانا آجاد کے بت چھوٹے ہیں۔ اور بیل کا بت بہت بڑا۔ کارخانے والے مہنگا دیتے ہیں۔ اور میں نہیں جانتا ——" پریم نے پھر قہقہہ لگایا " پارو! تیرے بھگوان بارہ آنے میں .... بارہ آنے اور میرے آزاد آٹھ آنے میں اور بیل ...... دو روپے میں دو روپے ...." وہ زور زور سے دیوانہ وار ہنسنے لگا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا ... "پارو اب ہم چلے .... ارے بھگوان کو سنبھال کر رکھنا بارہ آنے میں آیا ہے ...... ہا! ہا! ہا! بیل مہنگا ملا۔ میرے میز پر رکھ دینا ......"

وہ باہر جانے لگا .... پاربتی نے اسے روکنا چاہا۔ مگر وہ نہ رکا۔ وہ دیوانہ وار ہنس رہا تھا ...." بارہ آنے بھگوان .... میرا آزاد ...... آٹھ آنے ...." وہ جا رہا تھا"

پاربتی کے کانوں میں قہقہوں کی صدا، گونج رہی تھی .... وہ حیران کھڑی مٹی کے کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مسکرا رہے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ کتنی بھیانک تھی۔

غزل

از جناب سکندر علی وجد

عزم و تخیل کی سخت خامی — کیسی فلاکت کیسی غلامی

خلوت سے ترساں جلوت میں حیراں — عاشق بچارے عارف نہ عامی

مقتل بنا دے گی رہ گذر کو — یہ نوجوانی یہ خوش خرامی

بیڑا کرے گی غرقاب اک دن — کشتی نشینوں کی تشنہ کامی

پھولوں کے تختے ویراں پڑے ہیں — یہ باغباں کی بد انتظامی

بدنام اپنے، گمنام اپنے — اغیار سارے نامی گرامی

کس کو خبر ہے، کیا گل کھلائے
تیغ زباں کی یہ بے نیامی!

تسنیم مینائی

لال چندری

(۱)

"میں کہتی ہوں کہ آخر میرے لئے ایک لال چندری رنگوا دینے میں تمہارا کیا ہرج ہے کون سی اس میں شرع کے خلاف درزی ہوتی ہے جو تم کو اتنا تامل ہے۔ سات برس میری شادی کو ہوتے ہیں، قسم لو، جو تم نے ایک خواہش بھی میری پوری کی ہو" ہر بار یہی جواب ہے کہ "شرع کے خلاف" ہے۔ میں نہ عالم نہ فاضل معلوم نہیں کیا شرعاً جائز ہے اور کیا ناجائز، مگر اتنا ضرور سمجھتی ہوں کہ "لال چندری" اوڑھنا کسی طرح شرعاً منع نہیں۔ ابا جان کو خدا بخشے کیسے بڑے متشرع عالم تھے، مگر اماں نے میری ہی یاد میں کئی بار لال چندری اوڑھی، اور ابا جان نے کبھی نہیں ٹوکا۔ میں بھی تو آخر سنوں کہ وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے تم میرے لئے ایک لال چندری نہیں رنگوا سکتے۔ روپیہ پیسہ سب اللہ کا دیا گھر میں ضرورت سے زیادہ موجود ہے پھر کیا سبب ہے کہ میری ایک بات بھی نہ مانی جائے۔ ابھی کل بھابی جان آئی تھیں ان کے ساتھ ان کی چھوٹی بہن سلمہ بھی تھی دونوں سرخ چندریاں اوڑھے تھیں، کیسی خوش خوش تھیں اور ہونا بھی چاہیئے، ساون کا زمانہ ہے جھولے پڑے ہوئے ہیں چندریوں ہی کے دن ہیں۔ میں اگر جھولا نہیں جھول سکتی تو کیا چندری اوڑھنا بھی "کفر" ہے!"

صوفیہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی، اور دوسری اولاد، ماں کو مرے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے، باپ البتہ اس وقت مرے جب وہ گیارہ برس کی تھی سلیم اس سے بڑا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد سے سارے کاروبار کا مالک۔ محمد علیم تاجر چرم کے کارخانے کی یورپ تک ساکھ تھی۔ سلیم بہت ہوشیار تھا اور محنتی، باپ کے بعد بھی کارخانے اسی طرح بلکہ اس سے بہتر چلاتا رہا۔ صوفیہ شادی کے قابل ہوئی تو ماں نے نسبت کی تلاش شروع کی اس کی خوبصورتی اور ہنرمندی کے گھر گھر چرچے تھے، ہزاروں نہیں تو سیکڑوں پیام ضرور آئے ہونگے مگر سلیم کی عقل پر معلوم نہیں کیسے پتھر پڑ گئے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، مالدار، خوب رو، خوش صفات پیاموں کو چھوڑ کر صوفیہ کا عقد مولوی خیرات علی سے کر دیا، ماں کتنا کتنا چیختی رہی کہ بیٹا صوفیہ کو تم ہی نے انگریزی تعلیم دلوائی ہے، خیرات علی کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت کٹر مولوی ہیں، بھلا ان سے اور صوفیہ سے کیسے نباہ ہوگا۔ پھر خیرات علی میں کیا خوبی ہے سوائے روپیہ کے۔ سو وہ اللہ کا دیا اپنے گھر میں کچھ کم ہے جو اس پر نظر کی جائے دوسرے اور دو چار نہیں سیکڑوں نسبتیں ایسی بھی ہیں جہاں دولت خیرات علی سے بھی زیادہ ہے مگر سلیم اللہ کے بندے نے ایک نہیں سنی، آنکھ بند کر کے عقد کر دیا نتیجہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا۔ صوفیہ ہی ایسی تھی جو سات برس تک برداشت کرتی رہی، ماں نے تو شادی کے تیسرے برس ہی انتقال کیا۔ صوفیہ کی تکلیف کی اسکی

سوسائٹی پر تکلیف تھی۔ شروع شروع میں تو سلیم یہی سمجھتا رہا کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں، مگر رفتہ رفتہ اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ اس نے صوفیہ کو "دنیوی جہنم" میں ڈال دیا ہے، ہاتھ ملتا تھا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا مگر مجبور تھا، صوفیہ سی بہن اور وہ بھی اکیلی، سلیم کو اس سے اور اس کو سلیم سے بہت محبت تھی، اسی تعلق کی بنا پر صوفیہ کی تکلیفیں اس سے دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ کئی بار ارادہ کیا کہ صوفیہ کو طلاق دلوا دے، پھر بدنامی کے ڈر سے خاموش ہو رہا۔ صوفیہ بھی اللہ کی بندی ایسی صابر تھی کہ منہ سے کبھی شکایت کا لفظ نہیں نکلا۔ ساون کا زمانہ تھا، صوفیہ پھر آخر لڑکی تھی بائیس برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بھاوج کو دیکھکر لال چندری کا شوق اسے بھی ہوا، میاں سے فرمایش کی، انھوں نے پہلے تو ٹال مٹول کی، پھر صاف کہدیا کہ "میری مرضی نہیں" صوفیہ بھی انسان تھی اور گوشت پوست سے بنی ہوئی، رنج اور صدمے کے سبب سے ضبط نہ ہو سکا، اس نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی، سوچا یہ تھا کہ آج تک پلٹ کر یہاں سے بات نہیں کہی ہے، آج اتنا کہونگی تو شاید متاثر ہو جائیں۔ اور لال چندری رنگوا دیں اسے کیا معلوم تھا کہ "خیرات علی سے اتنا کہنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے"، صوفیہ کا اتنا کہنا تھا کہ "انھیں" تاؤ آگیا؟

"صوفیہ تم نے آج، وہ کیا ہے جو کسی شریف زادی کو نہیں کرنا چاہیئے۔ شرع کی خلاف ورزی ہونے کے علاوہ شوہر کو اُلٹ کر جواب دینا اور اس کی مرضی کا پاس لحاظ نہ رکھنا اخلاقی جرم بھی ہے، میں تمہیں دکھا دونگا کہ اس حرکت کے نتائج کیا ہوتے ہیں"۔ اتنا کہہ کر خیرات علی کمرے سے باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر ایک بکس میں کچھ کپڑے رکھے کچھ روپیہ رکھا ضروریات کی دو چار چیزیں ساتھ لیں اور گھر کو خدا حافظ کہا۔

(۲)

خیرات علی کے غائب ہو جانے کا صوفیہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ صاحب فراش ہو گئی دل اور روح تو اس کے پہلے ہی سے بیمار تھے، اب جسم بھی اثر پذیر ہوا۔ سلیم کو اطلاع ہوئی تو صوفیہ کو گھر لے گیا، حکیم، ڈاکٹر، وید، جھاڑ پھونک والے سبھی کا علاج ہوا۔ سلیم کی بیوی کو صوفیہ سے اپنی بہن کی طرح محبت تھی اس نے جان توڑ کر تیمارداری کی مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اسے جو چپ لگی تھی وہ کسی طرح نہ ٹوٹی۔ روز بروز کمزور ہوتی جاتی تھی، سلیم کا مایوس ہو کر یہ حال ہوا کہ کارخانے جانا، کاروبار کی طرف توجہ کرنا سب چھوڑ دیا، ہر وقت بہن کی پٹی کے پاس بیٹھا اس کی صورت دیکھا کرتا تھا؛ صوفیہ کے سامنے تو نہیں الگ چھپ چھپ کر روتا بھی تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہے۔ کسی سے سن لیا کہ "کلکتہ" میں ایک انگریز ڈاکٹر ہے جو دق کا علاج کرتا ہے۔ صوفیہ کو ڈاکٹروں نے دق تجویز کی تھی۔ فوراً صوفیہ کو لے کر کلکتہ روانہ ہو گیا۔

(۳)

خیرات علی غصے اور غیظ کے عالم میں چل تو دیا، مگر ٹرین میں بیٹھ کر خیال آیا کہ صوفیہ سی بیوی جس نے کبھی تم سے تو نہیں کہا چھوٹی جا رہی ہے محبت نے سمجھایا کہ اگلے اسٹیشن پر اتر پڑ اور واپس چلا جا۔ اگلا اسٹیشن تھا جنکشن، وہاں اتر کر دوسری واپس لے جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ قدرت کے کارخانے میں کسے دخل ہے، خود تو مولانا آدمی تھے، ٹرینوں سے واقفیت معلوم، قلی نے انھیں کلکتے والی گاڑی میں بٹھا دیا۔ وہاں پہونچے تو بے یار و مددگار کئی روز تو مارے مارے پھرے، روپیہ ساتھ زیادہ لائے تھے ایک ہوٹل میں کسی "کائیاں" نے انھیں بھانپ لیا آدمی بیوقوف نہیں تو مولویت کے سبب سے دنیا کی

اونچ نیچ سے واقف ضرور تھے، اس کے پھندے میں آگئے اور اس نے انھیں ایک "بالاخانے" پر پہونچا دیا، انھیں یوں دھوکا دیا کہ یہ ایک معزز ہوٹل ہے اور وہاں "نورجہاں" کو یہ پٹی پڑھائی کہ مال اچھا ہے اور سونا جانے نہ پائے، دو چار روز تو دونوں نے انھیں یوں ہی مغالطے میں رکھا پھر رفتہ رفتہ کھل کھیلنے لگے۔ خیرات علی آدمی بہت متشرع اور سوری تھے مگر "بدی سے مقابلے" کی ان میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔ پندرہ روز میں نورجہاں پر عاشق تھے اور اپنے عقائد میں متزلزل۔ دو مہینے میں تو اس نے یہ حال کر دیا کہ داڑھی مونچھ سب منڈا کر پینے بھی لگے۔ — دن بھر نورجہاں ہوتی تھی اور یہ، شام کا وقت تھا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی کرنیں لال لال شفق پر سے گزرتی ہوئی خیرات علی پر پڑ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی، جس نے خیرات علی کو مست کر دیا۔ سرور کے عالم میں نورجہاں سے گانے کی فرمائش کی، اور خود لیٹ کر سننے لگے۔

(۴)

سلیم صوفیہ کو کلکتے لے کر آیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رخصت پر انگلستان گیا ہوا ہے۔ سفر کی تکان کا اثر اس پر بھی تھا، اور صوفیہ تو بالکل نڈھال ہو گئی تھی خیال کیا کہ تبدیلِ آب و ہوا سے صوفیہ کو بھی شاید فائدہ پہونچے۔ دریا کے کنارے ایک بنگلہ کرائے پر لیا، بنگلے کے سامنے ایک طوائف کا بالاخانہ تھا۔ سلیم کو آئے آٹھواں روز تھا کہ صوفیہ کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی۔ دوپہر سے بگڑی تو شام تک یہ حالت ہوئی کہ ڈاکٹر حکیم، سلیم سب مایوس ہو گئے، سلیم کو ہچکی لگی تھی، ڈاکٹروں کے جانے کے بعد سے صوفیہ کی پٹی پہ سر رکھے رو رہا تھا صوفیہ کے پلنگ کے پاس شیشے کی کھڑکی تھی، شفق آلود سورج کی کرنیں اس میں سے چھن چھن کر صوفیہ کے سفید لباس اور چہرے پر پڑ رہی تھیں، سرخی اور سفیدی کا اتصال ایسا معلوم ہوتا تھا، صوفیہ لال چندری اوڑھے ہے — صوفیہ نے نگاہِ واپسیں سے اس منظر کو دیکھا، قدرت کی ستم ظریفی پر لبوں پر مسکراہٹ آ گئی، چہرے پر سکون تھا، آخری سانس کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں، اور ہمیشہ کے لئے سو گئی؛ ——

دور سے نورجہاں طوائف کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

"چندریا لال رنگ دے، موری رے"

ماہر القادری

عقیدت کے پھول

صدقے ترے آئینۂ ہستی کو نکھارا
قرباں ترے گیسوئے فطرت کو سنوارا

اللہ رے! تری شوکت و اجلال کا عالم
قدموں پہ ترے لوٹ گئی سطوت دارا

آتے ہی ترے دوڑ گئی خنکیٔ توحید
تھمتا ہی نہ تھا کفر کا چڑھتا ہوا پارا

تو نے ہی محبت کے سفینہ کو ترایا
ملتا ہی نہ تھا حسن کے دریا کا کنارا

تاریخ کے صفحات کو بھی ناز ہے جس پر
اِک گرتی ہوئی قوم کو اس درجہ اُبھارا

چلتی ہی رہے گی ترے احکام کی کشتی
بہتا ہی رہے گا ترے الطاف کا دھارا

اُس وقت کہ مٹھی میں تری سارا عرب تھا
کہتے ہیں ترا نان جویں پہ تھا گزارا

اس وقت بھی تھی تیری نبوت کی خدائی
آدم کی بھی تقدیر کا چمکا نہ تھا تارا

اب بھی تری عظمت پہ کٹا دیتے ہیں سر کو
اب بھی ہے ترا نام ہمیں جان سے پیارا

اَب بھی ہیں تری نام کی عظمت کے فِدائی
بغداد، فلسطین، سمرقند، بخارا

اے وہ کہ ترے ذکر میں تسکین دل و جاں
اے وہ کہ تری ذات دو عالم کا سہارا

اے وہ کہ ترے نام سے ٹلتی ہے مصیبت
ماہر کی طرف چشم عنایت کا اِشارا

قیسی رامپوری

سامانِ جنگ

(اس افسانہ کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے)

ریلوے لائن سے میلوں علیحدہ اور لاری کی سڑکوں سے دور افتادہ پہاڑوں کے سنگین آغوش میں ریاست سرتسی واقع ہوئی تھی یہی وجہ تھی کہ وہاں ابھی شیاطین کا گزر نہیں ہوا تھا۔ ہاں فرشتے روز قلتا ریاں مارتے ہوئے آتے تھے حوریں خرام معصومانہ کرتی ہوئی نازل ہوا کرتی تھیں۔ اور بعض مرتبہ خود دیوتا اتر کر لوگوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

اس ریاست کا نظام حکومت بھی نہ تو جمہوریت کی گندگی سے آلودہ تھا اور نہ آمریت کی کثافت سے ملوث تھا نہ یہاں نازی ازم کا فرعونانہ قہر تھا نہ فاشیت کا مجنونانہ جبر اور نہ اشتراکیت کی ساحرانہ حِر۔ ایک مُسن راجہ چوپالی میں رہا کرتا تھا جس کے قبضہ میں بیس آدمیوں کی زبردست فوج تھی تین ذاتی ملازم اور دو سو روپیہ کی سالانہ آمدنی ——— مشکل سے چار سو آدمی بستے ہوں گے۔ سرتسی میں ہندو اور مسلمان ملاکر نہ تو کبھی کوئی مندر جلایا گیا اور نہ کسی وقت کوئی مسجد ڈھائی گئی تھی۔ ان کو باہمی فساد کے لئے کوئی مواد ہی نہیں ملتا تھا۔ مہا سبھا، کانگریس، مسلم لیگ، انگریز، سوراج، گائے اور باجہ وغیرہ کے "اسرار" اگر کوئی ان کے سمجھانے کی کوشش بھی کرتا تو شاید وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یہ الفاظ ان کے لئے غیر ارضی تھے۔ وہ صرف دو باتوں کو سمجھتے تھے۔ کھیت جوتنا اور بارش کے لئے دعا کرنا۔ چنانچہ کھیتوں کی وسعت اور دعاؤں کی فراوانی ان کو اتنا غلہ بخش دیا کرتی تھی کہ ناج ان کے لئے سکے، نوٹ اور ہنڈی بن گیا تھا۔ سود کی خون آشامی اور ساہوکار کی خسیست یہاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ ہر شئے کا مبادلہ ہوتا تھا۔ اول یہاں تو اشیا ہی کیا تھیں تھوڑا سا ناج تھا لیکن نہ اتنا کم کہ اس کی قلت "یاروں" سے عشق ہی بھلا دے اور نہ اتنی کثرت کہ محض کھانے کے لئے زندگی کی آرزو پیدا ہو جائے۔ حسب ضرورت گڑ اور بقدر احتیاج روئی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی جنس نہیں تھی جس کا احتکار یا احتباس سرمایہ داری کے بچے پیدا کر دیتا۔ اور نہ مساوات کی ایسی مجہول اسپرٹ تھی کہ اشتمالیت کو تولید کا موقع مل جاتا۔ میں جہانیان جہاں گشت میں سے تو نہیں ہوں ہاں غیر آباد خطہ اور پہاڑوں سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی ہے چنانچہ جب میں پہلی بار اس عظیم الشان ریاست میں گھوڑے پر سوار اور ہیٹ سر پر رکھے ہوئے داخل ہوا تو یہاں کے لوگوں کے لئے ایک تماشہ بن گیا تھا جیوان مجھے تیور بدلکر دیکھ رہتے تھے۔

بوڑھے ہراس آمیز نظروں سے، بچے خوف زدہ آنکھوں سے اور عورتیں آشفتہ چتونوں سے دیکھ رہی تھیں۔

چند منٹ کے بعد مجھے ریاست کی پوری فوج نے جو بیس جرار سپاہیوں پر مشتمل تھی آگھیرا۔ ان کے بھیانک رنگ خوردہ بھالے ان کی دندانہ دار پرانی ہیبت ناک تلواریں اور ان کی کند چھوٹی چھوٹی سی کٹاریں میرے اوپر چھا گئیں میں نے اپنی آتشبار بندوق کو دیکھا جو چند ہی فیر میں اس لشکر کو آسانی منتشر کر دینے کا وعدہ کر رہی تھی مگر سیلاح سے جنگ کا کیا کام۔ میں اطمینان سے گھوڑے پر بیٹھا رہا آخر ریاست کا جری فیلڈ مارشل میرے قریب آیا اور گرج کر بولا "تم کون ہو؟"

اس کے جواب میں میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا جس کے جواب میں بیس ہاتھ اٹھے میرے ہاتھ سے مس ہوئے اور مجھے فوراً شاہی دربار میں پہنچا دیا گیا۔

میری یہ کیفیت تھی گویا کوئی سفید آدمی Zulu Land میں آگیا ہے زلو خونخوار و مردم آزار قوم ہے اور یہ لوگ نہایت امن پسند تھے۔

مجھے یہاں کی سادہ زندگی اور قدرتی مناظر اس قدر بھائے کہ میں یہاں چند ماہ کے لئے رہ پڑا۔ سیر و شکار، کبھی باجرہ کی اور کبھی گیہوں کی روٹی گھی کی غیر معین مقدار وغیرہ کے تو کہنے ہی کیا تھے۔

زندگی کا ایک ہمہ رس معیار بنانا دراصل ہے بڑا مشکل۔ ہر قوم، ہر ملک بلکہ انفرادی طور پر ہر انسان حیات کے چند اصول رکھتا ہے بہت کم ایسے اصول ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ حیات عامہ کے لئے کوئی مکمل ضابطہ یا لائحۂ عمل بنانا انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ قانون کے شدائد کا احترام کرے اور اس کی نیت سے جائز فائدہ اٹھائے۔

میں خمار گندم کے ازالہ میں زیادہ آداب ملحوظ رکھنے کا عادی نہیں تھا۔ مگر اس قریہ میں اس نشہ سے مخمور ہونا ہتک گناہ تھا وجہ یہ تھی کہ "خمر" جائز طور پر بنا ہوا تھا۔ اور چونکہ میں یہاں کا باشندہ نہ تھا اس لئے اس سے محروم تھا مجھے آلودۂ لذت (آسودۂ لذت کیسے کہہ سکتا ہوں) ہونے کے لئے "چوری" کرنے کی ضرورت تھی جس کے امکانات بھی یہاں پر تقریباً معدوم تھے۔ گاؤں سے باہر ایک بہت پرانا مندر واقع تھا جہاں میں شکار سے واپسی پر اکثر ٹھنڈا پانی پینے رک جایا کرتا تھا۔ اس مندر کے پروہت کے تین تنومند تندرست جوان لڑکے تھے اور ایک اسی قدر صحت مند لڑکی۔ مجھے پانی پلانے کی خدمت اس کے سپرد تھی لڑکے بالعموم کھیت پر ہوتے تھے صرف بوڑھا پروہت باہر بستی کے چبوترے پر پڑا رہتا تھا میں اس کے پاس ضرور رکتا تھا۔ اگر کبھی سیدھا چلا جاتا تو وہ محبت سے گالیاں دینے لگتا تھا۔

ایک روز مندر پر کوئی میلہ تھا گاؤں کے بہت سے مرد عورت جمع تھے اور پروہت بھی مع اپنے تینوں بیٹوں کے نہایت انہماک سے پوجا میں لگا ہوا تھا۔ میں شکار کو جا رہا تھا مگر گھوڑے پر سے اتر کر بستی کے چبوترے پر تماشا دیکھنے ذرا بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک جوان لڑکی تیزی سے مندر میں سے نکل کر آئی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا روشن آسمان پر گھنا ؤنے بادل آگئے ہوں اس نے آتے ہی میرے پیر میں ایک ٹھوسا دیا اور غصہ سے اپنی زبان میں بولی "ارے تم ستی دیوی کے چبوترے پر جوتے سمیت بیٹھ گئے ہو یا تو جوتے اتارو یا نیچے اترو" اس کے چہرے پر صحت کا خون جھلک رہا تھا میں نے پیار سے اس کی سادگی کو دیکھا اور بے پرواہی سے بولا "تم کون ہوتی ہو

مجھے ٹوکنے والی" پروہت جی تو کچھ کہتے نہیں ہیں"

"میں کون ہوتی ہوں"؟ میں پروہت جی کی بیٹی ہوں۔ بلاؤں بھیا کو وہ ابھی تمہاری ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیں گے"؟ اوہو یہ وہ لڑکی تھی جو روز مجھے پانی پلاتی تھی، لیکن شکل دیکھنے کی کبھی اجازت نہیں دیتی تھی آج اپنے نتھنے سے مگر ستحکم اعتقاد کی توہین کے انتقام میں بیاکانہ میرے سامنے کھڑی باز پرس کر رہی تھی آخر میں نے ہنسکر کہا۔" اپنے بھائی کو کیوں تکلیف دیتی ہو تم ہی میری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لو"؟ اگر قاتل کے آگے سر جھکا دیا جائے تو ضرور اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں رعشہ کی ایک خفیف سی حرکت پیدا ہو جاتی ہو گی۔ اس لڑکی کے خشمگیں تیوریں میں بھی ملائمت کا خفیف سا بال پڑ گیا تیز آواز سے بولی "لد کیا کروں روز تمہیں پانی پلاتی ہوں نہیں تو کر بتاتی"؟

"آج تم نے نیا جوڑا بدلا ہے یہ لال ڈوپٹہ تمہارے بدن پر کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے"؟ میں نے چڑانے کے لئے ال کا کھوج نکال لیا تھا اب نیا راستہ صاف کر رہا تھا"؟

"جاتی ہوں بھیا کو بلاکر لاتی ہوں"؟ اس نے سر سے آنچل اس انداز میں سرکایا کہ میں اس کے گلے میں اتل بے جوڑ کوڑیوں کی مالا بھی دیکھ لوں۔ عورت کتنی کمزور ہوتی ہے اپنے حسن کے ستائش کے باب میں۔

" اوہو تمہارے گلے میں یہ مالا کیسی پیاری ہے تم کتنی اچھی نظر آتی ہو اس کو پہن کر"؟ تیور پر غصہ تقریباً سو چکا تھا۔ اں اب لجا جاگتی جا رہی تھی حیا آتے ہی توہین مذہب کے انتقام کا مقدس فرض بھی نسائیت پر دانت پیستا ہوا رخصت ہو گیا اور ایک منٹ بعد ہی میری جانب سے گھونگھٹ نکالکر " عورت ــــ" چلدی"؟

اَب سندر کی چہار دیواری میں ایک گناہ آلودہ زبان سے گرایا ہوا دل معیشت کوشی کی راہ پر پڑ چکا تھا مجھے تین دن تک سندر میں اس لئے پانی نہیں پلایا تاکہ میں یہ سمجھ لوں کہ ستی کی بیحرمتی کی سزا ختم نہیں ہوئی ہے بلا ہاہی کراہتا ہوا اٹھتا اور اپنے لرزا ہاتھوں سے مجھے پانی پلا دیتا۔ چوتھے روز جب میں شکار سے واپس آیا تو ایک مرا ہوا تیتر چپکے سے سندر کی سیڑھیوں پر پھینکدیا اور پروہت کے پاس چبوترہ پر آ بیٹھا۔ میری اس حرکت کو اگر کوئی ہمارا بھائی دیکھ پاتا تو وہیں سر پھوڑ دیتا یا جواباً فوراً مسجد میں گوشت پھینکنے کا ثواب عظیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور اگر مسجد کے مولانا کو دیکھ لیتے تو فوراً ہی اعلان جہاد فرما دیتے۔

میری اس حرکت کو شاید سندر کی دیوی نے دیکھ لیا تھا تیتر کی ٹانگ پکڑ کر اپنے باپ کے پاس لے آئی اور میری طرف اشارہ کر کے اپنے باپ سے بولی۔

"یہ انھوں نے وہاں ڈالدیا تھا بابا"؟

بڈھے نے مردہ تیتر کو دیکھا اور ہنسکر بولا " جاؤ اسے دیجا کے جڑیوں میں جاکر ڈالدے ان کی اچھا ہو گی تو اس کی جان دیدیگی"؟ مگر اس کا تو گلا کٹا ہوا ہے بابا۔ جان کیسے پڑے گی اس میں"؟ سمجھدار لڑکی نے اپنے باپ سے کہا۔

" تمہارے پاس سوئی ڈورا تو ہوگا نا۔ ذرا اس کا گلا سی دو"؟ بڈھا ہنسنے لگا۔

طہارت پر پُرمعصیت حملہ کرنے میں ایک خاص لذت ہے اگرچہ اس میں نقصان معصیت کا ہی ہوتا ہے مگر گناہ جارحیت پسند واقع ہوا ہے میں بھی اسکی معصیت کو لوٹنے کے درپے ہو گیا تھا۔

" اچھا اب بھیا جی کو لاکر پانی پلا"؟ پروہت نے اپنی لڑکی سے کہا میں نے تین لوٹے پانی صرف کئے

آدھا پیا اور ڈھائی لوٹے سے کھیلتا رہا۔ پروہت حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔ مگر اس کی لڑکی پیارو نے اس کھیل میں بدمزگی کا اظہار نہیں کیا۔

بڈھے کو آج کھانسی بہت تھی اس لئے میں رک گیا اس کو مندر میں لے گیا سینے پر تیل وغیرہ کی مالش کی تو اس کو ذرا سکون ہوا۔ بڑی دعائیں دینے لگا۔

"بھیا تم کہاں سے آئے ہو کون ملک کے رہنے والے ہو تم؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا ملک یہاں سے بڑی دور ہے بابا کئی سو میل دور۔ جہاں ریلیں چلتی ہیں موٹریں دوڑی دوڑی پھرتی ہیں اور اس میں اتنے آدمی بستے ہیں کہ ان کی بھیڑ میں راستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"ہاں میں بھی ایک بار ریل میں بیٹھا تھا اس وقت رامو (اس کا بڑا لڑکا) پیدا بھی نہیں ہوا تھا بڑی بری سواری ہے ریل۔ اس میں اتنے آدمی بھر جاتے ہیں کہ کھڑے رہنے کو بھی جگہ نہیں ملتی ہے دھرتی ماتا پہ کیسے کیسے بوجھ لاد دیتے ہیں لوگوں نے جبھی تو بھونچال آ جاتے ہیں۔"

"پروہت جی کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم کسی بستی میں جاکر بس جاؤ؟"

"نہیں بھیا۔ بڑی بستیوں کی الجھنیں ہماری سمجھ میں نہیں آئی ہیں وہاں لوگ بات بات میں لڑتے ہیں بھگوان کے مندر میں ہر ایک کو گھسنے دیتے نہیں۔"

"بابا روٹی کھا لو ٹھنڈی ہو جائے گی۔ پیارو نے آکر کہا۔ "بھیا تم بھی کھا لو۔" پروہت نے مجھ سے کہا۔

"نہیں راجہ میرا راستہ دیکھ رہے ہوں گے اب مجھے چلنا چاہیے کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"پیارو بیٹی مجھے بھی ابھی بھوک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں کھاؤں گا میں بھی۔" "اچھا میں دودھ دودھ لاؤں۔" اس نے اپنے باپ سے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں پروہت جی۔ تم آج لیٹے ہی رہنا ہلنا جلنا مت۔ نہیں تو پھر کھانسی اٹھ آئیگی"

"اچھا بھیا بھگوان تیرا بھلا کریں۔ جا۔ بڑا اچھا آدمی ہے تو۔"

میں مندر کے باہر نکل آیا چوطرف تاریکی پھیل چکی تھی دور سے گاؤں کی آگ جلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں مندر سے آگے بڑھ کر مویشیوں کے احاطہ کے قریب پہنچا۔ تو وہاں پیارو ایک گائے کا دودھ نکال رہی تھی۔

"پیارو تم اب تک دودھ نہیں نکال سکیں؟" میں نے اس کے قریب آکر کہا۔

"نہیں" لوٹے کو نیچے رکھکر جواب دیا۔ "لاؤ ہم نکالیں دودھ" میں نے اس کے پاس بیٹھکر کہا۔

"تمہیں آتا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" میں نے اس کے جسم کو چھو کر کہا۔ معصیت کے بھبکوں سے اندھیرا زیادہ کالا ہوتا جا رہا تھا جس میں معصومیت اتنی دھندلی پڑ گئی تھی جیسے گہرے کنوئیں میں پانی تارا نظر آتا ہے آخر گناہ کی ایک پھنکار سے یہ تارا بھی غائب ہو گیا۔

آج کی شام میری لذت آلودگی کی شام تھی جبکی شب نے میرے اندر سے روز آنہ کا جذباتی سکر بہت بڑی حد تک زائل کر دیا تھا۔ میری خو کی ضد پوری ہو چکی تھی یہاں کی شریعت حیات میں یہ شائد پہلا کفر تھا جس کی عفونت سے میرے اسفل احساسات مست ہو رہے تھے۔ بیدینی معمولات مسلمہ سے روگردانی کا نام ہے لیکن "معمولات" مہذب بستیوں میں جاکر اپنی بدہیت کو بدلڈالتے ہیں چنانچہ میں بھی

اصول پرست گر نا آشنا رحقائق مخلوقات کی نگاہ میں ابھی بیدین نہیں ہوا تھا گیا ہوا اگر سرتیی کی مختصر سی بستی کے قوانین کی رو سے میں کافر ہو گیا ہوں۔ یونہی ہم سماج کے قوانین بنانے آئے ہیں یونہی اپنے ہاتھوں پر ان کی توہین کرتے رہتے ہیں اور جب تک سوسائٹی اور سیاست حق ایجاد انسان کے سپرد رہے گی یہی ہوتا چلا جائے گا اگر انسانیت اس کی متحمل نہیں ہوتی ہے تو اس کو آسمانی قانون و ضابطہ ڈھونڈنا چاہیئے۔

میرا منحوس گناہ پیارو کے مستقبل کو سیاہ کر چکا تھا۔ پیارو کے اقربا میری جان کے لاگو بن چکے تھے ریاست کی خوشگوار و کشادہ فضا میری گرد اذیت آفریں حصار تنگ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چنانچہ ایک اندھیری رات سے فائدہ اٹھا کر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہاں سے نکل بھاگا انسان اگر اپنے ہی جیسے انسانوں میں سیاہ کھیل کھیلتا رہے تو اس کا نباہ ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ناسازگار ماحول میں بھی اپنے طریق عمل پر کاربند رہتا ہے تو اس پر عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے اچھی باتیں نامساعد فضا میں زخم کھاتی ہوئی زندہ رہ جاتی ہیں مگر بڑی باتیں اکثر اچھے ماحول میں دم توڑ دیتی ہیں بوہیت کی سرانڈ میں محمدیت کا دم نہ گھٹ سکا تھا لیکن جب محمدیت کی خوشبو تند اٹھی تو اس میں بوجہلیت کی تعفن نہ جی سکی تھی۔

اس ناقابل اعتنا واقعہ کے عرصہ دراز تک میں دنیا میں ادھر ادھر گھومتا رہا حتیٰ کہ سرتیی اور پیارو دونوں کو بھول گیا بیس سال بعد میں ایک دفعہ جنوبی ہند کی طرف ایک پہاڑی علاقہ میں ریل کے اندر سفر کر رہا تھا کہ شام کے وقت ایک بڑا اسٹیشن آیا میں نے باہر سر نکال کر جھانکا تو تختہ پر نظر پڑی۔ اسٹیشن کا نام سرتیی تھا میں دیوانہ وار اتر پڑا اور باہر نکل کر پھٹے پھٹے دیدوں سے ہر شے کو دیکھنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ تو وہی مقام تھا جہاں میں بیس سال پہلے شکار کے لیے آیا کرتا تھا میں لپک کر گاڑی میں آیا جلد جلد اپنا اسباب اتروایا اور ایک عمدہ سے تانگے میں شہر کی طرف روانہ ہوا تانگے والے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے اٹھارہ سال سے ریلیں دھڑ دھڑاتی ہوئی گزر رہی ہیں یہاں پر کانچ کی ریت کا زبردست خزانہ برآمد ہوا ہے چنانچہ گورنمنٹ نے تین عظیم الشان گلاس فیاکٹریاں قائم کی ہیں جن میں سیکڑوں آدمی کام کرتے ہیں بہت سے انگریز آباد ہیں اور اب یہاں کی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔

میں کشادہ بازاروں، سر بفلک عمارتوں اور ان تمام تحیر خیز چیزوں کو دیکھتا ہوا گزر رہا تھا جن کو سرمایہ پیدا کر دیا کرتا ہے میری نظروں سے مسلم ہائی اسکول، سناتن دھرم کالج، خالصہ مڈل اسکول، آریہ پرنٹنگ پریس وغیرہ گزر رہے تھے۔ میں نے یہاں آ کر مسجدوں کے سامنے سے پولیس کی حفاظت میں مذہبی جلوس باجہ کے ساتھ نکلتے دیکھے میں نے یہاں انقلاب زندہ باد کے نعرے سنے میں نے اپنے اس دوران قیام میں ہندو مسلم فسادات کے تماشے دیکھے مجھے یہاں کلکتہ کے بہو بازار کی طرح طوائفوں کے بے شمار کوٹھے نظر آئے۔ اور جس ہوٹل میں میں مقیم تھا اس کے منیجر نے مجھ سے پیارو چکلہ دار کی سب سے زیادہ تعریف کی جس کے ہاں ہر وقت تازہ اور نیا مال ملتا تھا۔

یہاں ریل کی وجہ سے کھانے پینے اور پہننے کی اشیاء کی اب بیحد فراوانی تھی فینسی اشیاء اور

دیگر فضولیات کی بھی اس قدر بہتات تھی کہ مِل کے مزدور سے لیکر گورنمنٹ آفیسر تک کے لئے لازمیات بن گئی تھیں۔

یہاں اب رات دن دنگے فساد ہوتے رہتے تھے۔ روزانہ چوریاں ہوا کرتی تھیں کثرت سے فحش کاری تھی غرض انسانیت گروہوں میں تقسیم ہو کر عام انسانیت کا خاتمہ کر چکی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ریل اور موٹر یہاں بھر بھر کر تہذیب لائیں اور تہذیب ہر شئے کی فراوانی۔ اب ہر شئے انسان کی روزانہ کی ضروریات سے زیادہ موجود تھی کثرت سے غلہ آ چکا تھا۔ بےحد کپڑا آ چکا تھا۔ ہر شئے لائی جا چکی تھی۔

یعنی تہذیب نے اس بستی کے اندر باہر سے لاکر سامان جنگ جمع کر دیا تھا۔

سرتی کے باہر اب بھی وہ بوسیدہ مندر موجود تھا جہاں بیس سال پہلے آکر میں گناہ کی منڈی کھول گیا تھا۔ بوڑھے پروہت کے دونوں مندر لڑکے آتشک سے مر چکے تھے اور تیسرا کثرت عیاشی و شراب نوشی کی وجہ سے دق میں مبتلا ہو کر مندر میں پڑا کھانسا کرتا تھا۔ غرض ہر طرف شیطانی ناچ نظر آ رہا تھا۔ اب یہاں فرشتوں کے وجود کا کوئی قائل نہ رہا تھا۔

ملاحظہ ہو بقیہ (صفحہ ۸۴) کا۔ ان سوالات کا جواب "جلوۂ رنگین" میں ملاحظہ کیجئے۔ جہاں زخمی اور تندرست جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے گا۔

قیمت:۔ تین روپیہ۔ مجلد رنگین گرد پوش۔

نگینے:۔ مصنفہ مظفر حسین شمیم۔

افسانوں، ڈراموں، اور مضامین کا شاندار مجموعہ افسانے جن میں ڈراموں کی کشاکش، ڈرامے جن میں افسانوں کا سکون، مضامین جن میں افسانوں کا سکون اور ڈراموں کی کشاکش کا حسین امتزاج۔

اسلوب نگارش کی جدت، زبان کی خوبیاں، روزمرہ اور محاورہ کا لطف دیکھنا ہو تو نگینے ملاحظہ فرمائیے۔

قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنہ مجلد رنگین گرد پوش۔

تعبیریں:۔ مصنفہ محمد امین شرقپوری۔

محمد امین شرقپوری ادنیٰ طبقہ کے سب سے بڑے نقیب ہیں۔ وہ مظلوم طبقہ سے اپنے افسانوں کا مواد حاصل کرتے ہیں۔ فلاکت زدہ انسانوں اور معاشرت کے آہنی پنجوں میں گرفتار شدہ انسانوں کے مصائب کو عمیق مطالعے کی نظر سے دیکھتے ہیں ان کا دل سماج کی ہر بےبھڑی پر دھڑکتا ہے۔ اور ان دھڑکنوں کو کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ کہ دل و دماغ کی گہرائیوں تک اترتی چلی جاتی ہے۔ پڑھنے والے کے چہرے پر کا ہے مسکراہٹ اور کا ہے غم کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ زندگی کا یہ امتزاج ان کے تازہ افسانوں میں عروج پر ملیگا۔

قیمت:۔ دو روپیہ دو آنہ۔ مجلد رنگین گرد پوش۔

ہچکیاں:۔ مصنفہ صدیقہ بیگم سیوہاروی۔

ہچکیاں موت کے وقت بھی آتی ہیں۔ اور خوشی کے وقت بھی شاید آنسوؤں سے ہچکیوں کا رشتہ اتنا ہی ہے۔ جتنا قہقہوں سے، یہ افسانے ہنسی ہیں بلکہ انسانیت کی وہ ہچکیاں ہیں جو آنسوؤں کے تار سے باہم پرو کر مالا بنا دی گئی ہے۔ اس میں دہکتی ہوئی بھوک، مسکراتی ہوئی موت، اور اس پورے غلط نظام تمدن پر نفرت کی نظر ڈالتا ہوا قہقہہ، سب کچھ نظر آئے گا۔ قیمت۔ تین روپیہ چار آنہ مجلد۔

ذکر جمیل۔ مصنفہ ماہر القادری

قیمت۔ ایک روپیہ بارہ آنہ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔

جذبات

جذب عالم پوری

رازِ ہستی ذرا نہیں معلوم
یہ معمّہ ہے کیا نہیں معلوم

کیوں جفا مجھ پہ روز کرتے ہو
کیا مآلِ جفا نہیں معلوم

اہلِ کعبہ سے دیر والوں سے
کس سے خوش ہے خدا نہیں معلوم

کیا بتاؤں میں انتہا اپنی
جب مجھے انتہا نہیں معلوم

اک جھلک انکی میں نے دیکھی تھی
بعد ازیں کیا ہوا نہیں معلوم

رنجش بے سبب سے الجھن ہے
مجھ سے کیوں ہو خفا نہیں معلوم

مجھے مطلب ہے سجدہ کرنے سے
بت ہے یا وہ خدا نہیں معلوم

ڈھونڈتا پھر رہا ہوں میں اس کو
جس کے گھر کا پتا نہیں معلوم

اس سے محدود ہے سوال ترا
اس کی شانِ عطا نہیں معلوم

اس پہ ہے اعتمادِ چارہ گری
جسے دل کی دوا نہیں معلوم

جذب میں علمِ حق کا پرتو ہوں
اور اس کے سوا نہیں معلوم

ہماری تازہ مطبوعات

قدوس صہبائی بی۔ اے۔ آنرز۔ افسانوں کا مجموعہ

زلزلے:۔ ملکوں میں زلزلے آتے ہیں تو در و دیوار اور دشت کانپتے ہیں۔ لیکن جب دلوں اور دماغوں میں آتے ہیں۔ تو تمدن کی بنیادیں اور تہذیب کی سر بفلک عمارتیں کانپتی ہیں۔ ادیب کے ذہن رسا اور خیالات کی دنیا میں جب زلزلے آتے ہیں تو ان کی لرزشیں صفحہ قرطاس پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ اور نقش و نگار عالم کی لرزش کا سبب بن جاتی ہیں۔ ایسے ہی چند بیش بہا لرزشوں کے نقش آج آپ کے سامنے پیش ہیں۔

کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد رنگین گرد پوش۔ قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنے۔

احمد ندیم قاسمی۔ (افسانوں کا مجموعہ)

سیلاب:۔ قاسمی واقعہ کا انتخاب زندگی سے کرتے ہیں۔ دکھ درد سے کراہتی زندگی، مسرت کے آغوش میں ہنستی کھیلتی زندگی۔ محبت میں بے قرار اور غم روزگار سے گھری ہوئی زندگی، جس میں لوگ چوٹ کھاتے ہیں۔ چوٹ دیتے ہیں۔ روتے بسورتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں۔ کامیاب ہوتے ہیں۔ ناکام رہتے ہیں۔ فرشتے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیطان بن جاتے ہیں۔ لغزش کھا کر گرتے ہیں۔ سنبھل جاتے ہیں۔ قاسمی نے ایسے ہی خاکوں میں رنگ بھرا ہے۔ اور انہی نقوش کو ابھارا ہے۔

کتابت طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ **قیمت:**۔ تین روپیہ آٹھ آنے

منتخبہ احمد ندیم قاسمی (افسانوں کا مجموعہ)

انگڑائیاں:۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے پندرہ مشہور افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے ان افسانوں کا منتخب کرنے والا خود بھی افسانہ نگاروں کی اس نئی جماعت میں شامل ہے۔ اس لئے اس کی نگاہ انتخاب کی صحت مسلم ہے۔

اس مجموعہ میں عریان ادب کو دخل ہے نہ بے محل تقریر بازی کو۔ یہ افسانے زندگی کے اس ہیرے کے مختلف پہلو ہیں۔ جسے اردو افسانہ نگاروں نے تراشا ہے۔

کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ **قیمت:**۔ تین روپئے چار آنے

رئیس احمد جعفری۔ (افسانوں کا مجموعہ)

زندگی کی ٹھوکریں:۔ ان افسانوں کا ہر افسانہ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ زندگی جو ہم سب گزار رہے ہیں جو ہم سب کے سامنے گزر رہی ہے۔ جسے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں جس کا نغمہ اور نوحہ ہمارے کان زور سے سنتے رہتے ہیں۔ جس کی ناکامی اور حرمان نصیبی پھر جس کی کامیابی اور کامرانی ہمارے دماغ میں بسی رہتی ہے۔ جسے ہم کبھی یکسر خندہ و قہقہہ اور

کبھی آہ و بکا کی صورت میں دیکھتے ہیں۔
کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت۔ تین روپئے چار آنہ

تقدیریں از منظور بخاری۔ بی۔ اے
انسانی زندگی میں کیسے کیسے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اور دنیا میں انسان نے کیسی کیسی مشکلات پر قابو پاکر ترقی کی، بڑے بڑے انسانوں کی ایجادیں اور تصنیفیں کس طرح ظہور پذیر ہوسکیں۔ وہ کیا حالات ہیں جس سے کسی انسان میں بڑا بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کیوں اور کس طرح کوئی انسان یک بہ یک ہماری نگاہوں میں ممتاز شخصیت بن جاتا ہے۔ ایسے روح پرور سوالات کا جواب آپ کو تقدیریں دے سکتی ہیں جس سے آپ پر ظاہر ہوگا کہ کس طرح آج کا حقیر پیشہ ورکل کا ذی مرتبت انسان بن گیا ——— قیمت۔ ایک روپیہ۔

کروٹیں قدوس صہبائی۔ بی۔ اے (آنرز) (افسانوں کا مجموعہ)
کروٹیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ دردبھری زندگی بھی کروٹیں لیتی ہے، اور مچلتی ہوئی جوانی بھی، زمین بھی کروٹیں لیتی ہے اور آسمان بھی، دنیا کروٹیں لیتی ہے تو زار و زاریت تہ و بالا ہو جاتی ہے اور آسمان کروٹیں لیتا ہے تو آبادی ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
قدوس صہبائی نے ایسی بہت سی محسوس و غیر محسوس کروٹیں افسانوں کی شکل میں صفحات پر مرتسم کی ہیں اور کس وقت میں کی ہیں، جبکہ خود مصنف جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بے تابی کے ساتھ کروٹیں لے رہا تھا
کتابت و طباعت دیدہ زیب ——— قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنے

کردار از ماہر القادری۔ (ناول)
کردار نگار کا معجزہ، نفسیاتی تحلیل کا نقش رنگیں، انسانی زندگی کی صحیح تفسیر، پاکیزہ محبت، دلچسپ رومان۔ تہذیب مغربی پر پھبتی ہوئی طنز سوسائٹی کی سچی تصویر۔
کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت:۔ دو روپئے چار آنے۔

ادب اور انقلاب از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔
اردو کے ادبی انقلاب کے سب سے ممتاز علم بردار کے ان مقالوں کا مجموعہ جنھوں نے ہماری تنقید نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔
اس مجموعہ میں وہ تاریخی مقالہ " ادب اور زندگی شامل ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچادی تھی اور ترقی پسند تحریک کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے ساتھ بنگال کے باغی شاعر قاضی نذر الاسلام اور سوویٹ روس کے ادب پر وہ سیر حاصل مضامین ہیں جنھوں نے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے دل و نگاہ کو وسعت بخشی۔ کتاب کے شروع میں ایک اعلان نامہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند مرحوم، مولوی عبد الحق، اور مصنف کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ قیمت:۔ تین روپیئے آٹھ آنے۔ مجلد۔ رنگین۔ گرد پوش۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ۔

ادارۂ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن

ادارۂ اشاعت اردو کی ہر دلعزیز مطبوعات

کتابوں کی قیمتیں سکہ انگریزی (کلدار) درج ہیں

(جدید اڈیشن)	پائی	آنہ	روپیہ
روح اقبال۔ ڈاکٹر یوسف حسین	۰	۱۲	۵
فکر اقبال۔ غلام دستگیر رشید	۰	۰	۴
آثار اقبال " "	۰	۱۲	۳
فلسفۂ عجم۔ علامہ اقبال (جدید اڈیشن)	۰	۲	۳
داستان اردو۔ نواب نصیر حسین خیال	۰	۱۲	۱
تنقیدی جائزے۔ احتشام "	۰	۱۲	۳
نگارشات محمد علیؒ۔ رئیس احمد جعفری	۰	۱۲	۳
سراب۔ مجنوں گورکھپوری	۰	۶	۳
صید زبوں۔ " "	۰	۰	۲
سرگزشت۔ "	۰	۰	۲
وسوسے۔ فضل حق قریشی	۰	۱۲	۲
میخانۂ ریاض۔ تسنیم مینائی	۰	۴	۳
خطا۔ قیسی رامپوری	۰	۰	۳
نگینے مظفر حسین شمیم	۰	۱۲	۲
تعبیریں محمد امین شرقپوری	۰	۱۴	۲
جلوۂ رنگین ڈاکٹر محمد نصیرالدین	۰	۰	۴
ہچکیاں صدیقہ بیگم سیوہاروی	۰	۴	۳
ذکر جمیل ماہر القادری	۰	۱۲	۱
معاشیات پاکستان عبدالقدوس ہاشمی	۰	۸	۱
نفسیات زندگی شیر محمد اختر	۰	۱۲	۱
بچوں کی نفسیات " "	۰	۱۲	۱

	پائی	آنہ	روپیہ
سبزہ زار۔ قیسی رامپوری	۰	۴	۲
اسرار علی اختر	۰	۱۲	۲
دھوپ قیسی رامپوری	۰	۴	۳
ناتسیت شاہد حسین رزاقی	۰	۱۲	۲
خطا، قیسی رامپوری	۰	۰	۳
مکالمات ابوالکلام عقیل احمد جعفری	۰	۱۲	۳
اسلامی تہذیب کیا ہے غلام دستگیر رشید	۰	۸	۲
غبار قیسی رامپوری	۰	۸	۲
تنقیدی حاشیے مجنوں گورکھپوری	۰	۱۲	۳
مسکراہٹیں کوثر چاندپوری	۰	۱۲	۲
ہمایوں نامہ احمد الدین	۰	۰	۲
داستان کربلا سعید صدیقی	۰	۸	۲
افادات محمد علی رئیس احمد جعفری	۰	۱۲	۳
کروٹیں قدوس صہبائی	۰	۱۲	۲
تصوف مسائل مولانا عبدالماجد دریابادی	۰	۱۲	۱
ضربیں قیسی رامپوری	۰	۰	۳
زلزلے قدوس صہبائی	۰	۱۲	۲
انگڑائیاں احمد ندیم قاسمی	۰	۴	۳
سیلاب " " "	۰	۸	۳
زندگی کی ٹھوکریں رئیس احمد جعفری	۰	۴	۳

کتاب	پائی	آنہ	روپیہ
کردار ۔ ماہر القادری	۰	۴	۲
رنگین سپنے کوثر چاندپوری	۰	۱۲	۳
ادب اور انقلاب ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائپوری	۰	۸	۳
گرداب ۔ احمد ندیم قاسمی	۰	۱۲	۲
لہریں ۔ ڈاکٹر شفیق الرحمان	۰	۱۲	۳
افسانے اور ڈرامے سعادت حسن منٹو	۰	۱۲	۲
زندگی کے نئے زاویئے رئیس احمد جعفری	۰	۰	۳
مضامین عبدالماجد دریابادی	۰	۴	۴
محمد علی ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی	۰	۱۲	۲
مردوں کی مسیحائی ۔ " " "	۰	۴	۴
یقین و عمل ۔ عبدالقدوس ہاشمی	۰	۸	۲
مقالات محمد علی ۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری	۰	۱۲	۳
مقالات " حصہ دوم " " "	۰	۱۲	۳
رنگ محل ساغر نظامی	۰	۱۲	۳
نغمات ماہر ماہر القادری	۰	۰	۳
محسوسات ماہر " "	۰	۰	۳
ٹیگور اور انکی شاعری مخدوم محی الدین	۰	۸	۱
کاروان علم ۔ فیض محمد و بادشاحسین	۰	۰	۳
تعتدیرین منظور بخاری	۰	۰	۱
ہٹلر کا نیا نظام امتیاز حسین بی کام	۰	۱۰	۰
خدا اور کائنات ۔ ماہر القادری	۰	۹	۰
خواتین دکن ۔ عطاء الرحمن	۰	۰	۲

کتاب	پائی	آنہ	روپیہ
شادی و محبت ۔ مقصودہ فرحت	۰	۱۲	۰
تذکرۂ یورپین شعرائے اردو ۔ محمد سردار علی	۰	۱۲	۰
پریم پجارن ۔ قدوس صہبائی	۰	۱۴	۰
ستاروں پر زندگی کے امکانات ۔ محمد عبدالرحمن	۰	۹	۰
بخارا کا جمہوری انقلاب	۰	۹	۰
ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر		۹	۰
مرد انقلاب (شہزادہ کروپاٹکن کے حالات)		۱۲	۰
اقبال کا تصور زمان و مکان ۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی		۱۲	۰
سیاست جاپان ۔ علی امام بلگرامی	۰	۱۰	۰
اقبال کے خطوط جناح کے نام	۰	۶	۰
ابن خلدون کے سیاسی و معاشرتی نظریے ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری		۶	۰
جمہوریۂ چین ۔ میر عابد علی خاں	۰	۱۲	۱
گاؤدی عروج	۰	۱۲	۰
گاندھی جناح مراسلت ۔ ضیائی	۰	۱۲	۰
جنات کی دنیا ۔ مقبول سیوہاروی	۰	۴	۱
ہندوستان کا بڑا شاعر اور محسن	۰	۸	۱
مجنوں کے خطوط ۔ عطاء الرحمن	۰	۸	۲
کاشانۂ نادر " ۔	۰	۱۲	۱

ملنے کا پتہ

سید عبدالرزاق بک سیلر و پروپرائٹر ادارہ اشاعت اردو

عابد روڈ ـــــ حیدرآباد ـــــ (دکن)

اِدارہ اِشاعت اردو کی نئی کتابیں

روح اقبال:۔ مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب پروفیسر (جامعہ عثمانیہ)

ڈاکٹر یوسف کو اقبال کے کلام سے والہانہ شغف ہے اور انھوں نے اس کے ہر پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بظاہر صرف تین مقالوں پر مشتمل ہے جو اقبال اور آرٹ، اقبال کا فلسفۂ تمدن اور "اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات" پر لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان کے ضمن میں کلام اقبال کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی پڑگئی ہے۔ شاعری اور فنون لطیفہ کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اقبال کے شاعرانہ مسلک پر جو رومانیت، رمزیت، اور کلاسکیت کے امتزاج پرمشتمل ہے، طویل بحث کی ہے اور اس کو سمجھانے کے لئے اقبال کے چند موضوع مثلاً شیطان اور آدم، ابلیس اور جبریل، حور و شاعر، مسجد قرطبہ وغیرہ پیش کئے ہیں۔ اقبال کے کلام کا فنی تجزیہ کر کے اس کے امتیازی خصوصیتوں مثلاً شاعرانہ مصوری، ندرتِ تشبیہات، اثر آفرینی وغیرہ کو واضح کیا ہے۔ اِنفرادی اور اجتماعی خودی کے متعلق اقبال کے اصول بیان کئے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لئے تاریخی استقرار اور تسخیر فطرت کے لئے سائنس اور حکمت کی ضرورت کو ظاہر کیا ہے۔ زندگی کے مقصد اور فرد اور جماعت کے ربط کی وضاحت کی ہے۔ مملکت تمدن، معاشی، اور معاشرتی نظام کے متعلق اقبال کے تصور کو پیش کیا ہے۔ خدا کے وجود اور توحید کے متعلق وہ بنیادی خیالات درج کئے ہیں۔ جن پر اقبال کی ساری تعلیم کا دارومدار ہے۔ زمانہ، تقدیر اور جبر و اختیار کے مسئلوں پر بحث کی ہے اور آخر میں حیات و موت کے متعلق لطیف نکتے واضح طور پر پیش کئے ہیں۔

قیمت:۔ پانچ روپیہ بارہ آنے مجلد رنگین۔ گردپوش۔

فکر اقبال:۔ مرتبۂ غلام دستگیر رشید ایم۔ اے۔

اقبال! عالم اسلام کا وہ مفکر اعظم جس کے حقیقت افروز پیام، جس کے روح افزا کلام، اور جس کے حیات افروز فلسفے نے مرد مومن، اور بندۂ مسلم کو ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا۔ وہ زندگی جو اصل اسلام ہے۔ جو صرف اسلام کے لئے ہے۔ جسے لوگ جانتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

اقبال کے فلسفہ، اس کے کلام، اور اس کے پیام کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں۔ پرکھنا چاہتے ہیں۔ تو **فکر اقبال** کا مطالعہ کیجئے۔ یہ کتاب شاعر مشرق کے تاثرات و جذبات، افکار و خیالات، اور جوش گفتار کا ایک نہایت مکمل مجموعہ ہے۔

قیمت۔ چار روپیہ مجلد رنگین گردپوش

آثار اقبال:۔ از غلام دستگیر رشید۔ ایم۔ اے۔

کیا سچی بات کہی تھی علامہ اقبال نے کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اہل چمن کی انتہائی بدنصیبی ہوتی اگر "دیدہ ور" کے نغموں کو بھول جاتے۔ لیکن اہل چمن نے علامۂ اقبال کے نغموں کو نہیں بھلایا اور شاید کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ اَبتک

اقبال کی زندگی اوران کے افکار پراتنا لکھا جاچکا ہے کہ اقبال کا مطالعہ کرنے والا کئی درجن کتابوں کا محتاج ہوگیا جناب مرتب کا ہم سب پراحسان ہے کہ انھوں نے ایسے مضامین کو جن کے بغیر اقبال کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا یکجا کر دیا۔ اب ایک کتاب اشارا اقبال کے ذریعے آپ کو تقریباً تمام مشاہیر اہل قلم کے رشحات قلم سے واقفیت ہوسکتی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اب تک اقبال پراس سے جامع اور مفید کتاب نہیں لکھی گئی۔ انتخابات مضامین کے لئے فاضل مرتب کا نام ضمانت ہے کہ اس میں صرف جواہرات ہیں سنگریزے نہیں۔

قیمت:۔ تین روپیہ بارہ آنہ مجلد رنگین گردپوش۔

ازپروفیسر سید احتشام حسین۔

تنقیدی جائزے:۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔

یہ مجموعہ مضامین شاعروں اور ادیبوں کے لئے دعوتِ فکر ہے۔ اس میں علوم جدیدہ کی روشنی میں ادبی روایات اور تغیرات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے شعر وادب کی سماجی بنیادوں کا تجزیہ حکیمانہ اصول نقد کی مدد سے کیا گیا ہے۔ جو لوگ ادب کو محض تفریح کی چیز نہیں سمجھتے وہی اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

قیمت:۔ تین روپیہ بارہ آنہ مجلد۔ رنگین گردپوش

مصنفہ مجنوں گورکھپوری۔

صید زبوں:۔ صید زبوں ایک افسانہ ہے۔ اسی دنیا کے افراد کا، جو جبر وقدر اور غلط سماجی نظام کے شکار رہیں۔

صید زبوں زخمی دلوں کی دھڑکنوں، مجروح روحوں کی پکار، اور کشتہ وبسمل انسانوں کے اضطراب کی ایک مکمل تصویر ہے۔ بظاہر یہ ایک مسلسل وطویل افسانہ ہے لیکن حقیقتاً یہ ایک لمبی اور سرد سانس ہے۔

قیمت:۔ دو روپیہ مجلد رنگین گردپوش۔

سرنوشت:۔ مجنوں گورکھپوری۔

سرنوشت ایک ایسا ادب ہے۔ جس میں جیتی جاگتی زندگی موجود ہے۔ ایک ایسا ولدوز افسانہ جس کی تخلیق میں آہوں اور دل پاروں سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں حضرت مجنوں نے سب سے پہلے یہ شعر لکھا ہے۔ ؎

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

قیمت:۔ دو روپیہ۔ مجلد اور رنگین گردپوش

جناب فضل حق قریشی۔

وسوسے:۔ فضل حق قریشی۔ اسی دنیا میں انھیں واقعات اور حادثات کی بنیادوں پر رنگین ودلکش اور حیرت افزا افسانوں کی تخلیق وتعمیر کرتا ہے انسانی نفسیات کی مکمل تشریح کرتا ہے۔ لاینحل ذہنی افکار، سنسنی پیدا کرنے والے حادثات زندگی کی بھیانک مگر دلچسپ تصویریں، ضمیر کی کشمکش، روح کی مظلومیت، سیرت انسانی کے مدوجزر، زندگی کے اسرار ورموز کی نقاب کشائی کے لئے مصنف اپنا قلم اٹھاتا ہے۔ اور تعجب خیز طریقہ پر کامیاب ہوتا ہے۔ بارہ حیرت افروز افسانوں کا یہ شاندار مجموعہ جو اپنے مخصوص طرز انشاء اور اختصاصی موضوع (مطالعہ ذہن انسانی) کے اعتبار سے اردو ایک نئی چیز ہے۔ ہر افسانے کے اختتام پر آپ سوچیں گے کہ کاش کہانی ابھی ختم نہ ہوتی!

قیمت:۔ دو روپیہ بارہ آنہ مجلد۔ رنگین گردپوش۔

مصنفہ ڈاکٹر محمد نصیرالدین۔

جلوۂ رنگین:۔ زندگی افسانہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور حقیقت پر ختم ہوتی ہے یہ جب اپنی حقیقت محسوس کرتی ہے تو کیسی چھوٹی اور اداس سے ہوجاتی ہے۔ زندگی جب اداس ہوجائے تو اسے خوش بھی کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کیا ایک ڈاکٹر اپنے نشتر کی نوک سے کبھی کبھی ایسا کرسکتا ہے یا نہیں